جون ۲۰۲۵ء

زبان و ادب

بہار اردو اکادمی کا ماہانہ مجلّہ

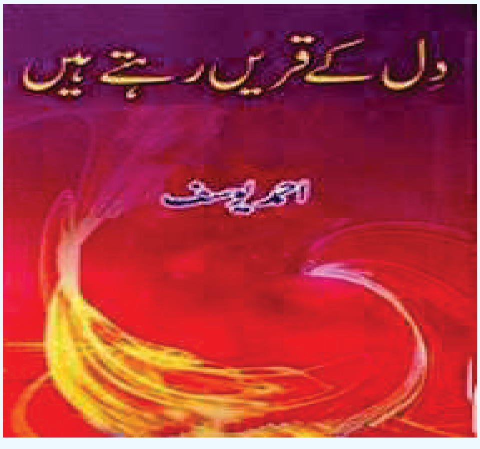

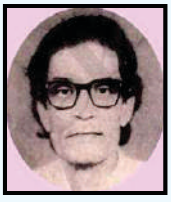

اپنی بات

شبیر احمد

''مجھے خبر نہیں کہ لوگ کس طرح اسرار ناپید سے واقف ہو جاتے ہیں۔ اپنا حال تو یہ ہے کہ نہ دیکھی ہوئی چیز پر اعتبار ہوتا ہے اور نہ سنی ہوئی باتوں پر اختیار۔ سماعت سے بصارت تک بہت فاصلہ نہ سہی، لیکن میرے لئے ان دونوں کے درمیان ہمیشہ ایک سپید، گہری، کہر آلود فضا حائل رہی ہے۔ میں نہ جانے کہاں سے مستعار شہپروں کے ذریعہ پرواز کرتا ہوا اَنجان وادیوں میں بھٹکتا رہا ہوں اور کبھی کبھی تو بڑی سے بڑی بلندیاں بھی چوم آیا ہوں، مگر چشم و گوش کے درمیان جو فاصلہ ہے، وہ اب تک طے نہیں ہوا، آنکھیں جو دیکھنا چاہتی تھیں، نہ دیکھ سکیں اور قابل سماعت ہر بات محروم گوش نظر آئی۔ ان تضادات کے درمیان ہم آہنگی کی ساری کوششیں مجھے پچھلے پہر کے تھکے ہوئے چراغ کے پگھلتے ہوئے آنسوؤں کی یاد دلا رہی ہیں اور جب یہ کھوئی ہوئی یادیں کسی بیقرار لمحے کی آنکھوں سے ٹپک گئی ہیں تو اُن لفظوں نے جنم لیا ہے جو میری روح کے کرب کا احاطہ کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ میں سیپ چنتا رہا ہوں اور دَرد کے موتیوں کے اظہار میں ناکامی مسلسل کا المیہ بنتا رہا ہوں۔'' (ہو بہو، ص ۸)

ڈاکٹر شبیر احمد، ادب کی دنیا میں صرف شبیر احمد کے مختصر نام سے متعارف ہیں۔ ان کی ولادت ۳۰ مارچ ۱۹۳۸ء کو اپنے نانیہال اسلام پور پری، لہریا سرائے دربھنگہ میں ہوئی، مگر تعلیمی اسناد پر ۱۶ جولائی ۱۹۴۲ء درج ہے۔ ان کے والدین کا نام عبدالودود اور عائشہ خاتون تھا۔ ایم اے، ڈپ ان ٹی اور اردو میں ڈاکٹریٹ کی سند رکھنے والے جناب شبیر احمد، پٹنہ کے ایک سرکاری اسکول میں درس و تدریس کے پیشے سے وابستہ تھے۔ اس کے علاوہ ''انجمن ترقی اُردو بہار'' سے بھی ان کی مستقل وابستگی رہی اور مشہور روزنامہ ''صدائے عام'' پٹنہ اور دیگر روزناموں میں بھی وہ مسلسل اپنی صحافتی خدمات انجام دیتے رہے۔ پروفیسر قمر اعظم ہاشمی اور پروفیسر لطف الرحمٰن اُن کے خاص دوستوں میں تھے۔ سہیل عظیم آبادی کی فکشن نگاری پر جامعاتی تحقیقی مقالہ لکھنے والے اور حضرت شاہ مصطفیٰ حسن فردوسی سے شرف بیعت رکھنے والے ڈاکٹر شبیر احمد کی ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۵۷ء کے آس پاس سے ہوا اور تقریباً زندگی کے آخری ماہ و سال تک وہ لکھتے پڑھتے رہے۔ کچھ دنوں کے لئے پٹنہ سیٹی کے ایک کالج میں تدریسی خدمات دینے والے شبیر احمد کی کہانیاں اور ان کے مقالے اور تبصرے ''سیپ'' (کراچی) ''بیسویں صدی'' (دہلی) اور ''آہنگ'' گیا وغیرہ جیسے موقر جرائد میں اشاعت یافتہ اور آل انڈیا ریڈیو سے نشر شدہ ہیں۔ دو افسانوی مجموعے ''اعتراف'' (جولائی ۱۹۷۶ء) اور ''ہو بہو'' (ستمبر ۱۹۸۶ء) کے علاوہ ''سہیل عظیم آبادی کی ادبی تہذیب کے'' نام سے اُن کا ڈاکٹریٹ کا مقالہ بھی ستمبر ۱۹۹۰ء میں اشاعت پا چکا ہے۔ ''پٹرو ڈالر''، ''ہو بہو''، ''شانتی'' اور ''کاندھے پہ ڈول ڈالے'' ان کی نمائندہ کہانیاں ہیں۔ متوسط طبقے کے درد و رنج کی عکاسی، تہہ دار علامت نگاری اور اسلامی تاریخ سے غذا یافتگی ان کی کہانیوں کے خاص اوصاف ہیں۔ ڈاکٹر شبیر احمد کی وفات ۷ رجون ۲۰۰۵ء کو ہوئی اور شاہ گنج قبرستان، پٹنہ میں وہ آسودہ لحد ہوئے۔

زبان و ادب

بہار اردو اکادمی کا ماہانہ مجلّہ

مدیر

ابرار احمد خان

سکریٹری، بہار اردو اکادمی

معاون مدیر

انوار محمد عظیم آبادی

جلد : ۴۶ شمارہ : ۶

جون ۲۰۲۵ء

زرتعاون : پندرہ روپے

سالانہ : ایک سو پچاس روپے

ترسیل زر اور خط و کتابت کا پتہ : سکریٹری بہار اردو اکادمی، اردو بھون، چوہٹہ، اشوک راج پتھ، پٹنہ ۸۰۰۰۰۴ (بہار)

فیکس/فون: 0612-2678021 - 2301476

Web : www.biharurduacademy.in

email : zabanoadabbua@gmail.com

buapat2014@gmail.com

کمپوزنگ : پروین اشرفی

تزئین : زیبا پروین

ترتیب

اداریہ	حرف آغاز	ابرار احمد خان	۳
مقالات	پروفیسر اعزاز افضل: شخصیت اور نگارشات	پروفیسر رئیس انور	۴
	دل کے قریں رہتے ہیں: ایک جائزہ	ڈاکٹر محمد قیام الدین	۱۴
	پروفیسر عبدالمغنی کی تنقیدی شناخت	ڈاکٹر احسان عالم	۱۸
	چمپارن کا گمنام شاعر و ادیب: عنایت الرحمٰن عنایتؔ	محمد ولی اللہ قادری	۲۳
	صنف انشائیہ: اہمیت و افادیت	محمد علی عالم	۲۹
ذکر املا	اردو املا: ایک بازدید	زبیر احمد بھاگلپوری	۳۱
افسانے	بنجر پور کا قبرستان	فاضل شفیع بٹ	۳۶
	قمرن بوا	ڈاکٹر نسرین بانو	۳۹
	دل بھی کتنا باغی ہے!	عطاء اللہ احمد	۴۴
گاھے گاھے......	گرمی کا سماں	عزیز مرزا	۴۷
منظومات	حمد باری تعالیٰ	محمد علی رضاؔ	۵۴
	......اور تم نہیں آئے	میکش اعظمی	۵۵
	غزلیں	انیس نظمیؔ	۵۶
	غزل	عطاؔ عابدی	۵۷
	غزلیں	سمیع احمد ثمرؔ	۵۸
	غزلیں	سلطان مظفر آزادؔ	۵۹
	غزلیں	محسن باعشن حسرتؔ	۶۰
	غزلیں	خالق حسین پردیسیؔ کابری	۶۱
	غزلیں	فرزانہ پروینؔ	۶۲
کتابوں کی دنیا	چہرہ سوال ہے — خورشید اکبر	مبصر : اظہار خضر	۶۳
	یادوں کے چراغ — اکبر رضا جمشید	مبصرہ : رابعہ خاتون	۶۷
سلام و پیام	ڈاکٹر درخشاں جمیل، محمد خرم نوازش، شاہین کوثر، ڈاکٹر شاہد فروغی		۷۰

بچوں کا زبان وادب

۷۳ —— ۸۰

''زبان وادب'' میں شائع ہونے والی تحریروں میں ظاہر کی گئی مصنّفین کی آرا سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں

اداریہ

حرف آغاز

تری حمد ہے خدایا ـــــــ ''زبان وادب'' کا تازہ شمارہ پریس میں جارہا ہے۔اس شمارے کا مقالاتی آغاز یادنگاری کی رمق لئے ہوئے اس تحریری عطیہ سے ہورہا ہے جس میں گویا ایک شاگرد نے اپنے استادمکرم پروفیسر اعزاز افضل کی شخصیت اور نگارشات کا بصد اخلاص وجامعیت تذکرہ کیا ہے اوراُن کی شفقت وعلمیت سے فیض یابی کا اعتراف کرتے ہوئے ان کے اشعار کی روشنی میں یہ بتایا ہے کہ اگر چہ انہیں بالعموم ترقی پسند شاعر کہا جاتا ہے،لیکن حقیقت یہ ہے کہ اُن کے یہاں عشقیہ اور عارفانہ شاعری کی زریں مثالیں بھی موجود ہیں۔ بعدازیں عملی وتنقیدی تجزیے اور برجستہ اقتباسات کے ساتھ ''دل کے قریں رہتے ہیں'' کے حوالے سے احمد یوسف کی خاکہ نگاری کے گوناگوں محاسن اُجاگر کئے گئے ہیں اور ''پروفیسر عبدالمغنی کی تنقیدی شناخت'' کے تعلق سے اُن کے تنقیدی مجموعے اور مضامین کی روشنی میں اُن کے تنقیدی موقف،تنقیدی نظریے، ان کے اسلوب نقد اوراُن کے یہاں موضوعاتی تنوع پر گفتگو ہوئی ہے۔اتنا ہی نہیں بلکہ اس حصہ میں کہیں خاندانی وسوانحی کوائف کے ساتھ ''چمپارن کے گمنام شاعر وادیب عنایت الرحمٰن عنایتؔ'' کی متنوع خدمات، ان کی مذہبی وصوفیانہ شخصیت، ان کی منصبی مزیات وفتوحات اوران کی شاعری ونثر نگاری پر باتیں ہوئی ہیں اور کہیں ''صنف انشائیہ کی اہمیت و افادیت'' کے متنوع پہلو واضح کئے گئے ہیں۔پس ازاں ''ذکرِ املا'' کے تحت تاریخی پس منظر دکھاتے ہوئے اور املا ورسم الخط کے فرق کی وضاحت کرتے ہوئے ''اردو املا: ایک بازدید'' کے عنوان پر چند ذیلی سرخیوں کے ساتھ قابل غور اور مفید مطلب نکات کے سامنے لائے گئے ہیں۔

اس شمارے میں ''افسانے'' کے تحت اگر ایک طرف ''بنجر پور کا قبرستان'' علاقائی عصبیت کے حوالے سے ایک سفاک حقیقت دکھاجاتا ہے اور حاجی ثناء اللہ جیسے کرداروں کو بے نقاب کرتا ہے تو دوسری طرف ''قمرن بوا'' کے احوال سے گزرتے ہوئے اپنی غرض کے لئے بیگم نعیم کا استحصالی کردار بھی آئینہ ہوجاتا ہے، البتہ عمدہ بنت رکھنے والی اس کہانی میں جب شرابی شوہر کے انجام، ایک بیوہ عورت کی پریشانی اور کم سن ثمینہ کو جنسی ہراسانی میں ڈالنے والے کردار کے دوش بدوش لاج کے لڑکوں کا اجتماعی ایثار کے جذبے سے سرشار عملی اقدام سامنے آتا ہے تو وہ ایک ذہن کشا اور حوصلہ بخش پیغام دینے میں بھی ناکام نہیں رہتا۔بعدازیں جوانی کے جذبوں میں شرابور رومانی ونفسیاتی کہانی ''دل بھی کتنا باغی ہے'' دیگر باتوں کے ساتھ ساتھ جب انجام کو پہنچتی ہے تو بالکل ایسا لگتا ہے جیسے ''مادر چہ خیالیم وفلک در چہ خیال'' کے مقولے کی تجسیم کردی گئی ہو۔

ہمیں امید واثق ہے کہ نہ صرف متذکرہ نگارشات مطبوع خاطر ہوں گی، بلکہ '' گاہے گاہے بازخواں'' میں ''گرمی کا سماں'' بھی جو اپنے ساتھ صرف ایک اسلوب ہی نہیں ایک فکر بھی لے کر آیا ہے، پسند آئے گا، ''منظومات'' کا حصہ اور ''کتابوں کی دنیا'' بھی جالب توجہ ہوگی اور ''بچوں کا زبان و ادب'' بھی ہمارے نونہالوں کو مطالعہ کی فرحتوں سے نواز دے گا۔زیادہ خدا حافظ، خدا ناصر!

ابرار احمد خان

(ابرار احمد خان)

مقالات

پروفیسر رئیس انور
Prof. Deptt. of Urdu, L.N.Mithila University, Darbhanga

پروفیسر اعزاز افضلؔ: شخصیت اور نگارشات

ہر زمانے میں چند ایسے برگزیدہ افراد پیدا ہوتے ہیں جن کا داخلی اور خارجی آکسپوز دوسروں سے بالکل الگ ہوتا ہے۔ انفرادی اور اجتماعی برتاؤ میں بھی عمومیت نہیں ہوتی ہے۔ ہوشمندی کے ساتھ ساتھ ایک طرح کی شان بے نیازی ان کی طبع کا حصہ ہوتی ہے، مگر شخصیت میں ہمہ گیری، جامعیت اور تہہ داری ہوتی ہے جو موقع ومحل کے لحاظ سے کھلتی اور روشنی بکھیرتی ہے۔ آج کی گفتگو ایک ایسے ہی معزز ومحترم فرد جناب پروفیسر اعزاز افضلؔ کی شخصیاتی اور فنکارانہ جہتوں پر مشتمل ہے۔

یوں تو پروفیسر اعزاز افضلؔ ایک مخلص اور ملنسار انسان، ایک مایہ ناز استاد اور سماجی سروکار اور عصری حسیت کے ممتاز شاعر تھے، مگر بظاہر ان کا شخصی آکسپوز بڑا سادہ اور عمومی تھا۔ وہ بولتے کم اور سنتے زیادہ تھے۔ اپنی خوش گفتاری سے کسی محفل پر چھا جانے کی کوشش نہیں کرتے تھے، مگر اپنی سادگی اور عالمانہ خاموشی سے کسی بھی محفل میں رعب اور سنجیدگی کا تقدس ضرور قائم کردیتے تھے۔ غالباً گھر کے دینی ماحول کا ان کی شخصیت پر گہرا اثر تھا۔ انہوں نے کلکتہ کے ایک قدیم ادبی گہوارے ٹالی گنج کے ایک نستعلیق گھرانے میں آنکھ کھولی تھی۔ ان کے دادا حافظ عبدالوہاب اور والد سید ابوالفضل مسجد میں امامت کے فرائض انجام دینے میں منہمک رہے تھے۔ ابتدائی تعلیم وتربیت سے ان کی مستحکم شخصیت کی تعمیر ہوئی تھی۔ ان ایام میں اس علاقے میں شعر وسخن کا بھی خوب چرچا تھا۔ مشہور اساتذہ حضرت آرزوؔ لکھنوی اور حضرت سید ابوالحسن رنگؔ لکھنوی مستقل طور پر وہیں مقیم تھے۔ علامہ وحشتؔ کلکتوی کی بھی آمد ورفت تھی۔ بچپن سے جوانی تک اعزاز افضلؔ اسی خوشگوار فضا میں سانس لیتے رہے۔ مدرسہ عالیہ میں تحصیل علم کے دوران سید امیر رضاؔ کاظمی (علامہ جمیل مظہری کے چھوٹے بھائی) سید سلطان صلاح الدین اور محمد اسماعیل وغیرہ جیسے اساتذہ سے درس لیا۔ بچپن میں جو شعری ذوق پیدا ہوا تھا اور عروض وآہنگ کے جو سبق حضرت رنگؔ لکھنوی سے لئے تھے، ان میں بالیدگی اور نکھار آنے لگا۔ گیارہ بارہ برس کی عمر سے انہوں نے باضابطہ شاعری شروع کردی۔ (سہ ماہی ''رابطہ'' کلکتہ اعزاز افضل فن اور شخصیت نمبر جون ۱۹۹۴ء ص ۱۳)

پروفیسر اعزاز افضل کا ابتدائی کلام محفوظ نہیں رہ سکا، مگر بنگال کے معروف محقق شانتی رنجن بھٹاچاریہ نے ٹالی گنج سے نکلنے والے قلمی ماہنامے ''پیغام'' کے فروری ۱۹۵۲ء کے شمارے میں ان کی ایک غزل کی نشاندہی کی ہے۔ اس غزل کا مطلع اور مقطع اس طرح ہے ؎

نہ چھیڑو اس قدر مجھ کو کہ کھل جائے زباں میری
گزرتی جارہی ہیں، حد سے اب خاموشیاں میری

نہیں ممکن کہ مل جائے کسی سے میرا شعر افضلؔ
انوکھا ہے بیاں میرا ، نرالی ہے زباں میری

(بحوالہ: سہ ماہی ''رابطہ'' ص ۵۱)

اس غزل کے ساتھ ان کا نام ابوالفضل افضلؔ درج ہے۔ وہ ابوالفضل سے اعزاز افضلؔ کب بنے، اس کی وضاحت کسی ذریعے سے نہیں ہوسکی۔ ۱۹۵۳ء میں مدرسہ عالیہ سے فراغت پاکر سنٹرل کلکتہ کالج (موجودہ مولانا آزاد کالج) میں داخل ہوئے۔ ۱۹۵۵ء میں آئی۔ اے اور ۱۹۵۷ء میں بی۔ اے اردو آنرز امتیازی نمبروں کے ساتھ پاس کیا۔ کالج میں پروفیسر عباس علی خاں بیخودؔ، نیاز احمد خاں اور شاہ مقبول احمد جیسے دیدہ ور اساتذہ کے زیر اثر ان کا ادبی اور شعری ذوق کچھ اور نکھر گیا۔ رہی سہی کسر یونیورسٹی میں پوری ہوئی جہاں معروف ترقی پسند شاعر اور جید استاد پرویزؔ شاہدی نے نہ صرف نصابی درس دیا بلکہ اپنی زمین میں ان کی غزل سن کر کچھ ایسا متاثر اور ملتفت ہوئے کہ باقاعدہ مشورۂ سخن دینے لگے۔

پرویزؔ شاہدی کی ایک مشہور غزل کا مطلع ہے۔

موقع یاس کبھی تیری نظر نے نہ دیا
شرط جینے کی لگادی مجھے مرنے نہ دیا

افضل صاحب نے طالب علمی کے زمانے میں یونیورسٹی کے مشاعرے میں اسی زمین میں جو غزل پڑھی، اس کا مطلع تھا۔

درسِ آرام مرے ذوقِ سفر نے نہ دیا
مجھ کو منزل پہ بھی، ظالم نے ٹھہرنے نہ دیا

یہ غزل پرویزؔ شاہدی سے شرفِ تلمذ کا ذریعہ بن گئی۔ افضل صاحب رنگؔ لکھنوی کے زیر سرپرستی وزن و بحر اور ردیف وقافیہ میں پختہ ہو چکے تھے۔ پرویزؔ شاہدی نے انہیں لفظوں کے تخلیقی استعمال کا ہنر سکھایا۔ شاعری پر فکری سان چڑھائی اور ایک ایسی دشا دکھائی کہ ان کے فکر وفن میں چار چاند لگ گیا۔ ایم۔ اے۔ میں نمایاں کامیابی حاصل کرنے کے بعد جلد ہی کلکتہ کے سی۔ ایم۔ او۔ ہائی اسکول میں تدریسی خدمات انجام دینے لگے۔ ۱۹۵۹ء سے ۱۹۶۶ء کے اوائل تک وہاں بچوں کی ذہنی نشو ونما میں حصہ لیا۔ اس دوران اردو کی ایک جامع گرامر لکھی جس میں صحت زبان کے ساتھ اردو لکھنے کا آسان طریقہ بتایا گیا تھا۔ اسکول کے بچوں کے لیے یہ بہت مفید گرامر تھی۔

افضل صاحب اپنی ادبی صلاحیت، علمی بصیرت اور انتظامی سوجھ بوجھ سے جلد ہی نائب ہیڈ ماسٹر مقرر ہو گئے، مگر اسی مدت میں انہوں نے اپنی شریک حیات کی مفارقت کے صدمات جھیلے اور نئے سرے سے ازدواجی زندگی کی شروعات بھی کی۔ کچھ عرصہ بعد افضل خداوندی سے سرکاری کالج میں لکچرر کے عہدے پر فائز ہوئے۔ کم وبیش بائیس سال ہگلی محسن کالج اور مولانا آزاد کالج میں درس و تدریس میں مشغول رہے۔ مادر علمی میں صدر شعبہ تھے، اُسی دوران ۱۹۸۹ء کے اواخر میں مغربی بنگال پبلک سروس کمیشن کے رکن نامزد ہو گئے اور وہاں کی شاندار کارکردگی کے بعد سبکدوش ہوئے۔

بہر حال یہ تو ہوا پروفیسر اعزاز افضلؔ کے سوانحی کوائف کا سرسری بیورا۔ اسے ”گاہے گاہے باز خواں ایں قصہ پارینہ را“ کے طور پر پیش کیا گیا۔ جہاں تک میری ذاتی واقفیت کا تعلق ہے، میں نے افضل صاحب کو ۶۲-۱۹۶۱ء سے دیکھا ہے اور کچھ کچھ سمجھنے کی کوشش کی ہے، ان دنوں والد مرحوم مجیب الرحمٰن ٹرانسفر ہو کر لیڈی برابورن کالج سے مولانا آزاد کالج کے شعبۂ عربی وفارسی میں آچکے تھے۔ ہماری رہائش گاہ گھنی آبادی والے علاقہ چونا گلی میں تھی۔ سرکاری رکارڈ میں اسے پیٹر لین کا نام دیا گیا تھا۔ آٹھ نمبر پیٹر لین میں ایک پرانی عمارت تھی جس کی تیسری منزل والد مرحوم نے کرایے پر لے رکھی تھی۔ اس کے پچھمی چھور پر گیارہ نمبر پیٹر لین میں سی۔ ایم۔ او۔ ہائی اسکول کی دو منزلہ عمارت تھی۔ ہمارے مکان اور اسکول کے درمیان ایک مخدوش مکان تھا۔ اسکول کی اوپری منزل پر ہیڈ ماسٹر کا چیمبر اور ٹیچروں کا کمرہ تھا۔

میں محمد جان ہائی اسکول میں پڑھتا تھا اور شام کو گھر کے پچھمی آنگن میں کھیل کود میں مصروف رہتا تھا جہاں سے اسکول کا بالائی کھلا ہوا حصہ نظر آتا تھا۔ کبھی کبھی اس حصے میں تین چار اساتذہ بیٹھے ہوئے خوش گپیاں کرتے نظر آتے تھے۔ ان میں ہیڈ ماسٹر ولی الزماں صاحب، جمیل احمد صاحب اور افضل صاحب کو میں پہچانتا تھا۔ ان تینوں میں سب سے کم عمر افضلؔ صاحب تھے۔ وہ بسا اوقات والد مرحوم سے ملنے آتے تو دونوں کے درمیان فارسی اور اردو شاعری پر گفتگو ہوتی اور اس کی بازگشت میرے کانوں تک پہنچتی تھی، مگر میرے پلے نہیں پڑتی تھی۔

بعض لوگوں میں کچھ ایسی خصوصیتیں ہوتی ہیں کہ دوسروں کو متوجہ کر لیتی ہیں۔ افضل صاحب میں بھی کچھ ایسی باتیں تھیں۔ یوں تو وہ درمیانہ قد، سانولی رنگت، کشادہ پیشانی، سر پر گھنے بال، نہ بڑی نہ چھوٹی، مگر گہری آنکھیں، قدرے لمبائی لئے ہوئے چہرہ، جبڑوں سے چپکے ہوئے گال، ستواں اور نمایاں ناک، متناسب لب، انگلش طرز کی پتلی موچھیں (بعد میں موچھوں سے نجات حاصل کر لی تھی) متوازن

گردن اور مجموعی طور پر دبلی پتلی کاٹھی کے شخص تھے۔لباس کے معاملہ میں بڑے محتاط تھے۔ جامہ زیب ہونے کے باوجود عموماً گہرے سیاہی مائل رنگ کی پینٹ اور سفید بش شرٹ استعمال کرتے تھے۔کبھی کبھی چوڑی مہری کے پیجامے اور سفید کرتے میں بھی نظر آتے تھے۔

وہ فطرتاً کم آمیز اور کم گو تھے۔آواز بھی دھیمی تھی۔ لہجے میں متانت تھی تاہم قابل گرفت بات یہ تھی کہ جب چلتے تو پتا نہیں چلتا کہ کوئی نحیف شخص چل رہا ہے۔چھوٹے چھوٹے قدم میں بڑی تیزی اور پھرتی ہوتی تھی۔بچپن سے ان کی سبک رفتاری دیکھ کر مجھے حیرانی ہوتی تھی۔پچیس تیس سال بعد بھی ان کی تیز گامی میری توجہ کا مرکز بنی رہی۔ میں دراز قد ہونے کے باوجود بہت اطمینان سے چلتا ہوں،مگر جب بھی ان کے ساتھ پیدل چلنے کا اتفاق ہوا، اپنی رفتار تیز کرنا پڑتی تھی۔

اُسی کی دہائی میرے لیے اس لحاظ سے اہم تھی کہ اس کی ابتدا کے ساتھ میں مولانا آزاد کالج میں داخل ہوا۔وہاں کئی شناسا استاذ نظر آئے۔ شاہ مقبول احمد صاحب ، پروفیسر جاوید نہال صاحب اور پروفیسر افضل صاحب کو میں پہلے سے جانتا اور پہچانتا تھا۔ان کے علاوہ فخر الدین صدیقی، نصر غزالی اور عبدالستار شاہدی صاحبان تھے۔ یہ سبھی اساتذہ بڑی محنت اور توجہ سے پڑھایا کرتے تھے۔اس زمانے میں کالج میں ٹسٹ بھی ہوا کرتا تھا،جس کی کاپی مذکورہ اساتذہ جانچتے اور غلطیوں کی نشاندہی کرتے۔

افضل سر غالب، یگانہ چنگیزی، فانی بدایونی اور اصغر گونڈوی پڑھاتے تھے۔ان کی تخصیص یہ تھی کہ وقت کے بڑے پابند تھے اور کلاس روم میں آ کر وقت برباد کئے بغیر پڑھانے میں مشغول ہو جاتے تھے۔وہ طلبہ کو اس بات کی ترغیب دیتے کہ متعلقہ متن گھر سے پڑھ کر آیا جائے۔ ان کا حافظہ بڑا مضبوط تھا۔اکثر کتاب دیکھے بغیر پوری غزل پڑھا دیتے اور شعروں کی ترتیب میں کسی طرح کا خلل نہیں پڑتا تھا۔کبھی کبھی ہمیں جانچنے کے لیے متن پڑھواتے اور اگر کہیں غلطی ہوتی تو اس کی توجیہ و تصحیح کرنے کے بعد مشکل لفظوں، ترکیبوں، تشبیہوں وغیرہ کے معنی کی وضاحت کرتے اور آخر میں تشریح کرتے۔ ان کا انداز تدریس اتنا دلفریب تھا کہ متن اور معنی ذہن نشیں ہو جاتے اور دوبارہ ان سے رجوع کرنے کی نوبت نہیں آتی۔

ایک اچھے استاد کی یہ خوبی ہوتی ہے کہ وہ طلبا کی ذہنیت اور نفسیات سے واقف ہونے کی کوشش کرتا ہے۔ ہر کلاس میں مختلف ذہنی سطح اور سوجھ بوجھ کے طلبا ہوتے ہیں۔ان کے ادبی شعور اور لسانی فہم و ادراک میں فرق ہوتا ہے، اس لیے استاد کو ایک ہی بات کئی انداز سے پیش کرنا ہوتی ہے۔کبھی بالکل سپاٹ اور آسان زبان میں،کبھی قدرے معیاری زبان میں اور کبھی حسن بیان کی طلسمی کیفیت کے ساتھ۔افضل سر اس ہنر سے کماحقہٗ واقف تھے۔شاعری پڑھانے پر انہیں ملکہ حاصل تھا۔میں نے بھاگلپور اور متھلا یونیورسٹی میں ملازمت کی۔ابتدائی دنوں میں، ان دونوں یونیورسٹیوں کے علاوہ بہار کی دوسری جگہوں کے اساتذہ کو تفہیم شعر کی میزان پر جانچتا تو مجھے تشفی نہیں ہوتی تھی۔استاذی افضل صاحب میں ایک عجیب خوبی یہ تھی کہ معیاری اور بلیغ شعر سن کر جھوم اٹھتے تھے۔ پڑھاتے وقت بھی ان پر ایک کیفیت طاری رہتی تھی۔ بڑی دلجمعی سے شعر پڑھتے ، جائزہ لیتے، تشریح کرتے۔ان کے چہرے کی بشاشت سے احساس ہوتا کہ وہ خود شعر کی فنی خوبیوں سے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔دیوان غالب کے پہلے شعر

نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

کی تشریح و توضیح میں وہ خاص وقت دیا کرتے تھے اور تلمیح، ترکیب اور حقیقت ومجاز کے حسن اور معنی سے ان کے انسلاکات پر نہایت ہی بصیرت افروز گفتگو کرتے تھے اور معنی کی ممکنہ صورتوں سے بھی آگاہ کرتے تھے۔

اردو کے اہم افسانہ نگار ڈاکٹر اقبال حسن آزاد نے بی۔ اے۔آنرز مولانا آزاد کالج سے کیا ہے۔وہ مجھ سے ایک سال جونیئر تھے۔ایک بار انہوں نے فیس بک پر افضل سر کے متعلق ایک عجیب بات لکھی،جس سے مجھے قطعی اتفاق نہیں ہے،وہ لکھتے ہیں:

''یک روزہ وہ (اعزاز افضل) کلام غالب پڑھا رہے تھے کہ ایک شعر سامنے آ گیا۔

نظر میں ہے ہماری جادۂ راہِ فنا غالب
کہ یہ شیرازہ ہے عالم کے اجزائے پریشاں کا

شعر پڑھتے پڑھتے اعزاز افضل صاحب رُک گئے اور پھر کچھ توقف کے بعد خود ہی کہنے لگے کہ 'جادہ' معنی بھی 'راہ' اور راہ معنی بھی راہ تو پھر 'جادۂ راہ' کے کیا معنی ہوئے۔ ہم طالب علم کیا بتا سکتے تھے۔ پھر وہ اپنی جگہ سے اٹھے اور بولے، علامہ جمیل مظہری صاحب یہاں آئے ہوئے ہیں، چل کر ان سے دریافت کرتے ہیں، چنانچہ ان کی رہبری میں ہم لوگ اسی وقت علامہ کی قیام گاہ کی جانب روانہ ہو گئے۔ وہ اپنے چھوٹے بھائی جناب رضا مظہری کے یہاں ٹھہرے ہوئے تھے...... پروفیسر اعزاز افضل صاحب نے ہم لوگوں کے وہاں جانے کا مقصد گوش گزار کیا۔ علامہ جمیل مظہری صاحب نے بتایا کہ 'جادۂ راہ' کے معنی پگڈنڈی کے ہوتے ہیں۔ اس کے بعد انہوں نے اس شعر کی بڑی عالمانہ تشریح کی۔''

(اقبال حسن آزاد، فیس بک پیج، ۱۴ جون ۲۰۲۲ء)

اس ضمن میں اتنا عرض ہے کہ مولانا آزاد کالج کا شمار کلکتہ کے بہترین کالجوں میں ہوتا ہے۔ ہمارے زمانے میں اس کالج میں سخت نظم نسق تھا۔ ایسا ممکن نہیں تھا کہ کالج کے نظام الاوقات کے دوران کوئی پروفیسر تمام طلبا کو لے کر کیمپس سے باہر چلا جائے۔ نیز یہ بعید از قیاس ہے کہ پروفیسر اعزاز افضل صاحب جو خود بہت سنجیدہ اور ذمے دار استاد تھے، اس طرح کی غیر ذمے دارانہ حرکت کے مرتکب ہوں۔ علامہ جمیلؔ مظہری کی عالمانہ حیثیت اور شعر و ادب پر ان کی نگاہ دور رس میں شک وشبہ کی گنجائش نہیں، مگر غالبؔ کا مذکورہ شعر یا ''جادۂ راہ'' کی ترکیب کوئی ایسی مشکل نہیں کہ استاد مرحوم کی سمجھ سے بالاتر ہو۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ غالبًا ایسا نہیں ہوا ہوگا۔ اقبال حسن آزاد کے حافظے نے دھوکا دیا ہے۔

استاذ مرحوم کی تدریس کے متعلق ایک دو باتیں اور یاد آ رہی ہیں۔ فانیؔ بدایونی پڑھاتے ہوئے وہ فرمایا کرتے تھے کہ بعض حضرات فانیؔ بدایونی کو میر تقی میرؔ کی طرح غم والم کا شاعر سمجھتے ہیں، صرف اس لیے کہ دونوں کے یہاں حزن و ملال اور رنج و محن ہے، اس پر غور نہیں کرتے کہ میرؔ نے آپ بیتی میں جگ بیتی پیش کی ہے، وہ قنوطی شاعر نہیں ہے، جب کہ فانیؔ قنوطیت میں مبتلا ہیں۔ وہ عموماً متخالف حالات سے مایوس ہو جاتے ہیں۔ غم اختیار کرنے کی ترغیب دیتے ہیں۔ میرؔ کے یہاں اس طرح کا شعر کہاں ہے۔

غم بھی گذشتنی ہے، خوشی بھی گذشتنی
کر غم کو اختیار کہ گذرے تو غم نہ ہو

ان دنوں بی۔ اے۔ آنرز میں میر امن کی داستان ''باغ و بہار'' داخل تھی۔ ایک استاد نے پڑھاتے ہوئے یہ بتایا کہ اس میں چار درویشوں کی کہانی ہے اور ہر درویش کی کہانی پیش کرنے سے پہلے عنوان لگایا گیا ہے۔ ''سیر پہلے درویش کی''، ''سیر دوسرے درویش کی''، وغیرہ۔ سیر عربی لفظ سیرت کی جمع ہے۔ عام طور پر لوگ سیر (بمعنی سیاحت) پڑھتے ہیں جو غلط ہے۔ اس لفظ کے نئے تلفظ اور معنی سے مجھے بے اطمینانی تھی۔ دو تین دن تک بے چینی رہی۔ داستان کو کئی بار پڑھا، بے چینی بڑھتی گئی۔ افضل صاحب یاد آئے۔ وہ ان دنوں لور چیت پور روڈ میں واقع حافظ جمال الدین مسجد سے متصل مکان میں رہا کرتے تھے اور عموماً عشاء کی نماز کے بعد مسجد کے اتری کنارے کے ایک کمرے میں بیٹھا کرتے تھے۔ اس میں دیوار سے لگی دو تین لکڑی کی الماریاں کتابوں سے بھری رکھی ہوئی تھیں۔ زمین پر ایک چٹائی بچھی ہوئی تھی جس پر وہ خود بھی بیٹھتے تھے اور ملاقاتی بھی۔

اُس دن میں پہنچا تو استاذ ی الماری سے ٹیک لگا کر نیم داز تھے اور کسی کتاب کے مطالعے میں غرق تھے۔ مسکراتے ہوئے بڑی شفقت سے ملے۔ تھوڑی دیر اِدھر اُدھر کی بات کرنے کے بعد میں نے مسئلہ رکھا۔ سن کر مسکرائے پھر فرمایا:

''تم نے داستان پڑھی ہے؟''

میرا مختصر جواب تھا: ''کئی بار......''

فوراً انہوں نے پوچھا:

''کیا اس میں درویشوں کی سیرت بیان کی گئی ہے؟''

کچھ دیر سوچنے کے بعد میں نے کہا:

''اس میں درویشوں کی زندگی کے بعض واقعات ہیں، مگر انہیں سیرت نہیں کہا جا سکتا۔'' سن کر مسکراتے ہوئے فرمایا کہ:

''جب سیرت کا بیان نہیں ہے تو سِیَر کیسے کہا جائے گا۔
یہ صحیح ہے کہ عربی لفظ ''سیرت'' کی جمع 'سِیَر' ہے، مگر اس
داستان میں درویشوں کی سیر و سیاحت کے واقعات ہیں
اور وہ لفظ 'سیر' ہی ہے، 'سِیَر' نہیں۔ چند الفاظ ایسے ہیں
جن کا املا ایک ہی طرح کا ہے، مگر تلفظ اور معنی میں فرق
ہوتا ہے۔ کبھی مغالطہ ہو تو جملہ یا مضمون غور سے پڑھ کر
اسے دور کر لینا چاہئے۔''

میں ۱۹۷۳ء سے ان کے اس کمرے میں آنے جانے لگا تھا۔ (جسے ہمارے بعض ساتھی خانقاہ کہا کرتے تھے) کبھی کبھی میں نے انہیں کچھ عجیب موڈ میں دیکھا۔ وہ کھوئے کھوئے سے رہتے اور کچھ بولنے یا سننے کے بجائے چائے پینے اور اپنی پسندیدہ سگریٹ ولس فلٹر کے کش لینے میں منہمک رہتے۔ خالی خالی آنکھوں سے اِدھر اُدھر دیکھتے۔ کبھی کبھار ایک دو جملہ ادا کرتے۔ بس ملنے والے آتے، بیٹھتے اور تھوڑی دیر میں یہ سمجھ کر چلے جاتے کہ کسی وجہ سے استاد کا موڈ خراب ہے۔ کسی دن ایسا بھی ہوتا کہ تھوڑی دیر میں وہ بالکل نارمل ہو جاتے اور موجود لوگوں میں سے کسی کی طرف کاغذ بڑھاتے ہوئے بولتے لکھو۔ اس کے بعد کوئی غزل املا کرا دیتے پھر پڑھوا کر سنتے اور رکھ لیتے۔ اس طرح کی چند غزلیں کسی اخبار یا رسالے میں چھپی ہوئی نظر آتیں اور بعض غزلیں پتا نہیں کہاں چلی جاتیں۔ اس بات کو ان کے درج ذیل بیان کی روشنی میں سمجھا جا سکتا ہے:

''میں پورے سال میں عام طور پر ایک یا دو یا زیادہ سے
زیادہ تین غزلیں ہی کہہ پاتا ہوں۔ غزلوں میں بھی عام
طور پر پانچ یا زیادہ سے زیادہ سات اشعار ہوتے ہیں۔
ایک غزل مکمل کرنے میں مجھے ہفتوں اور کبھی کبھی مہینوں
لگ جاتے ہیں۔ اشعار کہنا اور پھر انہیں پھاڑ کر پھینک
دینا میرا پرانا مشغلہ ہے۔'' (سہ ماہی ''رابطہ'' اعزاز افضل: فن
اور شخصیت نمبر، ص ۱۳)

ان کے اس کھوئے کھوئے رہنے اور بالکل خاموشی اختیار کئے رہنے والی ادا پہلے میری سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ کچھ عرصہ بعد تخلیقی مرحلوں کے متعلق کتابوں اور تحریروں سے علم ہوا کہ دراصل کسی قلم کار کا وہ موڈ تخلیقی عمل کا ہوتا ہے جہاں قلم کار باطنی سطح پر تخلیق کے نازک مرحلوں سے گزرتا ہے اور اپنے ظاہری وجود سے دور ہو کر باطن میں سمایا ہوا ہوتا ہے اور مواد و ہیئت کی ترتیب و تزئین سے تخلیق کا نگار خانہ آباد کرنے میں گم رہتا ہے۔ سنجیدہ تخلیقات میں استاذی پر یہ موڈ طاری ہوتا تھا، ورنہ ان کی بہت سے شعری نگارشات ہیں جو فی البدیہہ وجود میں آئی ہیں۔ رمضان کے قصیدے ''آبشار'' اور ''آزاد ہند'' جیسے موقر اخباروں میں چھپنے والے قطعات وغیرہ اسی زمرے میں رکھے جا سکتے ہیں۔ کسی نے مجھے بتایا تھا کہ ''میر ضاحک'' کے فرضی نام سے بھی انہوں نے فی البدیہہ طنزیہ و مزاحیہ شاعری کی ہے جو کسی اخبار کی زینت بنتی تھی۔

بہر کیف اب میں اپنے ذاتی تجربات ساجھا کرتا چلوں۔ ۱۹۷۸ء میں ایم۔ اے۔ کرنے کے بعد میں نے پروفیسر ظفر اوگانوی صاحب کی نگرانی میں پی ایچ۔ ڈی کے لیے رجسٹریشن کرایا۔ میرا موضوعِ تحقیق تھا۔ ''اردو میں نثری نظم'' ان ایام میں علی گڑھ سے نکلنے والے رسالے ''الفاظ'' میں اس موضوع پر لگاتار بحث ہو رہی تھی۔ ہر چند نثری نظم سے افضل صاحب کو دلچسپی نہیں تھی، مگر وہ ہر طرح کی چیزیں پڑھتے اور اَپ ڈیٹ رہتے تھے۔ جب میں نے انہیں موضوع کے متعلق بتایا تو بڑے خوش ہوئے اور ہدایت دی کہ ''الفاظ'' کے شماروں سے مدد لوں۔

میں ایم۔ اے۔ کا امتحان دینے کے بعد والد مرحوم اور افضل صاحب کے مشورے سے کلکتہ کے شاعر جنم جی مترا ارمان کے تذکرے ''نسخہ دلکشا'' کی ترتیب و تصحیح میں مشغول ہو گیا تھا۔ ظفر صاحب میرے اس کام سے زیادہ خوش نہیں تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ اس طرح کا کام سینئر لوگ کرتے ہیں، جونیر لوگوں کو نئے نئے موضوعات اور جدید ادب پر توجہ دینی چاہئے، اس سے ادبی دنیا میں جلد پہچان بن جاتی ہے۔

ترتیب کا کام آدھے سے زیادہ ہو چکا تھا اور میں پیچھے ہٹنا نہیں چاہتا تھا، مگر اس سلسلے میں افضل صاحب نے ظفر صاحب کی بات سے اتفاق کیا، پھر میری ضدی طبیعت کا خیال کرتے ہوئے مشورہ دیا کہ دو تین مہینے میں تیزی سے کام مکمل کر لینے کے بعد پی ایچ۔ ڈی۔ والی تحقیق میں مشغول ہو جانا بہتر ہوگا۔ انہوں نے اشعار کی تصحیح میں بڑی مدد فرمائی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۹۷۹ء کے اوائل میں کام مکمل ہو گیا اور

وسط میں کتاب چھپ گئی۔

ان ہی دنوں حکومت مغربی بنگال کی طرف سے اقبال صدی سیمینار کا انعقاد ہونے والا تھا۔ کبھی کبھی سالک لکھنوی صاحب کے یہاں بھی ہم لوگوں کی بیٹھک ہوتی تھی۔ ایک دن افضل صاحب بھی وہاں موجود تھے اور سیمینار کے مندوبین پر بات چیت ہو رہی تھی۔ دوران گفتگو انہوں نے سالک صاحب کو بتایا کہ کلکتہ کے بنگلہ اور اردو کے ایک شاعر جنم جی مترا غالب کے ہمعصر تھے۔ انہوں نے اردو شاعروں کا ایک تذکرہ ''نسخہ دلکشا'' لکھا تھا پھر میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ انہوں نے بڑی محنت سے اس تذکرے کی ترتیب وتصحیح کی ہے اور چھپوایا ہے۔ اس کی رسم اجرا کے لیے بھی فنکشن کے بعد شام میں آدھے گھنٹے کا وقت نکالا جائے اور ڈاکٹر محمد محسن صاحب کے دست مبارک سے اجرا کرادیا جائے۔

سالک صاحب نوجوان قلمکاروں کی ہمیشہ ہمت افزائی کرتے تھے، فوراً تیار ہوگئے اور یہ طے پایا کہ اقبال سیمینار کے مندوبین سے سالک صاحب اور افضل صاحب اس سلسلے میں رابطہ کریں گے اور پروگرام ایران سوسائٹی کے ہال میں ہوگا۔ میرے والد مرحوم ایران سوسائٹی کے لائف ممبر تھے۔ دوسرے ہی دن کمیٹی سے اس کی منظوری مل گئی۔

میں قدرے تذبذب میں تھا کہ انتظام کیسے ہوگا، مگر افضل صاحب نے نہ صرف حوصلہ دیا بلکہ اپنی انتظامی صلاحیت کا بھرپور مظاہرہ کرتے ہوئے پروگرام کی کمان سنبھال لی۔

جید نقاد ڈاکٹر محمد حسن کی صدارت میں بہت شاندار تقریب ہوئی۔ افضل سر نے خود اس کی نظامت کی۔ پروفیسر ظفر اوگانوی، پروفیسر شاہ مقبول احمد، پروفیسر فخر الدین صدیقی، شانتی رنجن بھٹا چاریہ اور اقبال سیمینار کے کئی مندوبین بشمول پروفیسر سید صباح الدین عبدالرحمٰن اس میں شریک ہوئے۔ جنم جی مترا ارمان کے پڑپوتے دلیپ کمار مترا کلکتہ ہائی کورٹ میں ان دنوں سولیسٹیر تھے۔ وہ بھی بہ نفس نفیس تشریف لائے۔ اس پورے پروگرام کے محرک اور انتظام کار استاذی افضل صاحب تھے۔ شاگرد نوازی کی اس سے بہتر مثال ملنا مشکل ہے۔

۱۹۸۰ء کے وسط میں افرو ایشین رائٹرس ایسوسی ایشن کی ایک کانفرنس رابندر سدن، کلکتہ میں ہوئی۔ اس میں کئی ملکوں کے شاعروں اور ادیبوں نے شرکت کی۔ افضل صاحب بھی منور رانا، رئیس آنولوی، غلام نبی اور راقم السطور کے ساتھ متحرک تھے۔ وہ ہندی اور بنگلہ کے قلمکاروں کے ساتھ انتظامات میں ہمہ تن مصروف رہے۔ اس یادگار کانفرنس میں ڈاکٹر محمد حسن اور فیض احمد فیض بھی شامل ہوئے تھے۔ فیض پورے مجمع کی نگاہ کا مرکز بنے ہوئے تھے۔ اس کے باوجود استاذی نے ہم طلبا کا ان سے تعارف کرایا اور دو ایک سوال پوچھنے کا موقع فراہم کیا۔

ایک دن میں ان سے ملنے گیا تو انہوں نے فرمایا کہ کل دن میں گیارہ بجے ریڈیو اسٹیشن چلنا ہے۔ انہیں غزل رکارڈ کرانا تھی۔ جناب قیصر قلندر اسٹیشن ڈائرکٹر تھے اور مٹھولیا جی نام کے ایک شخص اردو ہندی پروگرام کے انچارج تھے۔ رکارڈنگ کے بعد موصوف مجھے لے کر ڈائرکٹر صاحب کے کمرے میں گئے۔ وہ بڑے تپاک سے ملے۔

بات چیت کے درمیان استاذی نے انہیں گوش گزار کیا کہ کلکتہ میں اردو بولنے والوں کی اتنی بڑی آبادی ہے۔ اردو میڈیم اسکول ہیں، مدارس ہیں، لکھنے پڑھنے والوں کی بھی کمی نہیں ہے مگر ریڈیو اسٹیشن سے اردو کا باضابطہ پروگرام نہیں ہوتا ہے۔ اس پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ قیصر قلندر صاحب نے ان کی باتوں سے اتفاق کیا اور صلاح دی کہ اس کے لیے دو تین عوامی پٹیشن دلوائی جائے تاکہ ڈائرکٹر جنرل کے سامنے رکھی جاسکے۔ پھر کیا تھا، واپس آکر افضل صاحب نے معین صاحب (رائٹرس بلڈنگ میں کسی عہدہ پر فائز تھے) قمر عالم ملک (جو کسی اسکول میں ٹیچر تھے) منور رانا اور راقم السطور سے رائے مشورہ کیا اور حقائق وشواہد اکٹھا کرنے کی ذمے داری دی۔ بیچ بیچ میں طریقہ کار کا تعین ہوتا رہا۔ آخر کار ایک جامع پٹیشن تیار ہوا جس میں کلکتہ، ہوڑہ اور مضافات کے اردو میڈیم پرائمری اور سکنڈری اسکولوں اور مدرسوں کے نام، طلبا کی تعداد، ادبی انجمنیں، اداروں کے نام پتے، اخباروں کے نام پتے اور کتابوں کی دکانوں کی تفصیل، جلسوں، مشاعروں اور قلمکاروں کی مختلف تفصیلات وغیرہ درج کی گئیں۔ سیکڑوں لوگوں کے دستخط ہوئے اور ایک وفد کے ذریعے اسے ڈائرکٹر کے دفتر میں پیش کیا گیا۔ اتفاق سے میں اس میں شریک نہیں ہوسکا۔ دو تین دن قبل مجھے بھاگلپور یونیورسٹی

جوائن کرنے کے لیے جانا پڑا تھا۔

اس طرح کے کئی چھوٹے بڑے واقعات ہیں، جن کے پس پردہ استاذی سرگرم رہے ہیں۔شاید وہ اپنی مرنجاں مرنج طینت اور اپنے بے ہمہ وباہمہ مزاج سے مجبور تھے، جو کام انہیں مناسب معلوم ہوتا، وہ کر گزرتے۔ شہرت اور نام ونمود کے پیچھے نہیں بھاگتے۔ شاگردوں کی مدد اور رہنمائی کے لیے ہر وقت تیار رہتے تھے۔ جو کام ان کے بس میں ہوتا، اپنا کام پس پشت ڈال کر اسے پہلے کردیتے اور چہرے پر شکن تک نہیں آتی۔

ان کی حیات کے آخری تیس برسوں کے دوران میں ان سے ہمیشہ فیض یاب ہوتا رہا۔مغربی بنگال پبلک سروس کمیشن کے ممبر ہونے کے بعد ان کی مصروفیت بڑھ گئی تھی پھر بھی شاگردوں اور دوسرے ملنے والوں کے لیے ان کا اخلاق اور اخلاص اسی طرح کا تھا۔تمام دفتری سرگرمیوں سے سبکدوش ہونے کے بعد کسی حد تک گوشہ نشینی اختیار کر لی تھی۔ دسمبر ۲۰۰۴ء میں کسی کام سے میں کلکتہ آیا تھا۔۴ر دسمبر کو استاذی سے ملنے رپن اسٹریٹ والے ان کے نئے فلیٹ میں گیا۔ بڑی گرم جوشی سے ملے اور دیر تک مختلف موضوعات پر بات کرتے رہے۔ انہیں دیکھ کر احساس ہوا کہ بہت کمزور ہو گئے ہیں۔ چہرے سے نقاہت ظاہر ہو رہی تھی۔ بات بھی آہستہ آہستہ کر رہے تھے۔آتے وقت انہوں نے اپنی کتاب ''خد و خال'' عنایت فرمائی اور اس پر میرے متعلق حوصلہ افزا کلمات کے ساتھ یہ بھی تحریر کیا:

> ''اپنے بہت عزیز شاگرد ڈاکٹر رئیس.....کو بے شمار دعاؤں کے ساتھ ـــــ اے گل بہ تو خرسندم،تو بوئے کسی داری۔''

یہ تحسین آمیز اور دعائیہ تحریر میرے لئے سرمایۂ حیات ہے۔ مجھے کیا خبر تھی کہ یہ تحریر ان کی آخری یادگار بن کر میرے پاس رہ جائے گی اور نئے عیسوی سال کا پہلا دن ہی پیغام اجل لے کر آجائے گا۔ مرزا شوق لکھنوی نے بالکل سچ کہا ہے ؎

موت سے کس کو رستگاری ہے
آج وہ کل ہماری باری ہے

لیکن استاد ذوقؔ قلم کار کی موت میں ایک مثبت پہلو ڈھونڈ نکالتے ہیں ؎

رہتا قلم سے نام قیامت تلک ہے ذوقؔ
اولاد سے تو بس یہی دو پشت چار پشت

یقیناً فن لازوال اور لافانی ہوتا ہے اور فن کی وجہ سے فنکار بھی تنقید کی میزان پر زندہ رہتا ہے۔ استاذی اعزاز افضلؔ کی نگارشات جب تک موجود ہیں اور ان کے قارئین موجود ہیں، وہ شعر وادب کے حوالے سے اس وقت تک زندہ رہیں گے۔

بلاشبہ افضلؔ صاحب ایک اچھے اور سچے فنکار تھے۔ان کی فنکارانہ شخصیت کی جلوہ نمائی شعر اور نثر دونوں میں ہوئی ہے۔ یہ بھی درست ہے کہ بنیادی طور پر وہ شاعر ہیں۔غزل کے شاعر ہیں اور بلند پایہ شاعر ہیں تاہم ان کی نثری تحریروں میں حسنِ بیان اور لطافت زبان کا سرور کم نہیں ہے۔ اگر ان کی مطبوعہ نگارشات کا بالترتیب جائزہ لیا جائے تو فنکاری کی جہات اور ترجیحات کا اندازہ لگانا آسان ہوگا۔

افضلؔ صاحب نے اپنی ڈیڑھ سو غزلیں ۱۹۷۰ء میں ترتیب دے کر اسرار کریمی پریس، الہ آباد بھیجی تھی، مگر بوجوہ اس کی اشاعت نہیں ہو سکی۔ مسودہ بھی ضائع ہو گیا۔اس کے نتیجے میں ان کی باقی ماندہ غزلوں کا پہلا مجموعہ ''زخم صدا'' ۱۹۷۴ء میں کلکتہ سے شائع ہوا۔اس میں مصنف کے دیباچے اور اظہار تشکر کے علاوہ جید قلم کار ل۔ احمد اکبر آبادی کے تفصیلی مقدمے، معروف نقاد ڈاکٹر محمد حسن کا مختصر مضمون (مطبوعہ ''عصری ادب'' شمارہ نمبر ۹،۲، ۱۹۷۲ء) اور علامہ جمیل مظہری کی رائے شامل ہے۔ ان تحریروں سے افضلؔ صاحب کی حیات کے چند اوراق روشن ہوتے ہیں نیز شاعری کی معنی خیز گرہیں کھلتی ہیں۔ علامہ جمیلؔ مظہری کی رائے کے اس اقتباس سے افضلؔ صاحب کی شاعری کی خوبیوں اور خصوصیتوں کا اندازہ ہوتا ہے:

> ''موجودہ دور میں نوجوان اردو شاعروں ....میں عزیزی اعزاز افضل سلمہٗ ہی وہ منفرد شاعر ہیں جن کے بعض اشعار کو پڑھ کر مجھے رشک بھی آتا ہے......ان کے اشعار میں جو رعنائی، گیرائی اور گہرائی ہوتی ہے، وہ ان کی انفرادیت کی ضامن ہے۔ وہ نظمیں بھی کہتے ہیں، کم کہتے ہیں، مگر بہت سلجھی ہوئی کہتے ہیں، مگر ان کی محبوب

صنف غزل ہے۔ان کا شعورفن اسی میں اپنی توانائی کا اظہار کرتا ہے۔'' (زخم صدا،کلکتہ۱۹۷۴ء،فلیپ)

زبان وبیان کے متعلق حضرت ل۔احمد آکبرآبادی کا یہ بیان نتیجہ خیز ہے:

''افضل صاحب محذوفات سے اکثر کام لیتے ہیں اور ہر اچھا شاعر اس طرز کو ترجیح دیتا ہے،مگر اس کے لئے الفاظ و بیان پر غیر معمولی عبور حاصل ہونا ازبس ضروری ہوتا ہے۔ افضل صاحب کو زبان و بیان پر ایسا عبور حاصل ہے کہ ان کے محذوف مفاہیم قاری کے ذہن پر صاف اور واضح ہو جانے میں دیر نہیں لگتی ہے۔'' (زخم صدا،ص۱۴ اوص ۱۵)

ڈاکٹر محمد حسن موضوع ومواد پر نگاہ ڈالتے ہیں اور یہ رائے قائم کرتے ہیں:

''اعزاز افضل کی شاعری پہلے بھی اور آج بھی سماجی افراتفری اور اس افراتفری کے سبب فرد کے اندر کے گہرے کرب کی آئینہ دار ہے، اسی لئے ان کی شاعری میں تھکن نہیں ہے، تازگی ہے۔ اعزاز افضل......کی غزلوں نے اچھوتے مضامین کا بڑی سادگی اور تیکھے پن سے احاطہ کیا ہے۔ اعزاز صاحب کی غزلیں اب تک جدید Absurdity سے پاک ہیں۔ اگر کسی کی شاعری کو زندہ رہنا ہے تو اس کے اندر تین خصوصیات کا ہونا لازمی ہے۔ فنی رچاؤ، جدید خیال و افکار اور اچھوتا پن۔ افضل صاحب میں یہ تینوں خصوصیات موجود ہیں۔''

(زخم صدا،ص۲۴)

۱۹۷۴ء میں شائع ہونے والا مجموعہ کلام ان رایوں اور تجزیوں سے مزین تھا،مگر اس کے بعد منظر عام پر آنے والے مجموعوں میں کسی طرح کی رائے وغیرہ شامل نہیں ہے۔۱۹۸۰ء میں شائع ہونے والا دوسرا مجموعہ بھی غزلوں پر مشتمل ہے۔اس میں افضل صاحب نے اپنی باتیں غزلیہ شعروں کے توسط سے رکھی ہیں۔اندر کے ایک ورق پر اپنے استاد پرویز شاہدی کا شعر درج کیا ہے ؎

ان پڑھ آندھی گھس پڑتی ہے توڑ کے پھاٹک محلوں کے
''اندر آنا منع ہے'' لکھ کر لٹکانے سے حاصل کیا

اس شعر سے ایک طرف استاذی کے نظریۂ حیات کی توجیہ ہوتی ہے اور دوسری طرف ایوان شاعری میں پوری توانائی کے ساتھ افضل صاحب کی موجودگی کی دھمک بھی ملتی ہے۔ دوسرے ورق پر نامور عروض داں شاعر شاؔد عارفی کا شعر درج ہے ؎

اس نے جب سو تیر چلائے
میں نے ایک غزل چپکا دی

اس شعر کے نشانے پر ان کے معاصرین ہیں۔ ہر دور میں ہم عصر فنکاروں کے درمیان چشمک ہوتی رہی ہے۔ اس سے شعر وادب کو بہت فائدہ بھی ہوا ہے۔غور وفکر کے نئے دروازے کھلے ہیں۔زبان و بیان کا حسن نکھر کر سامنے آیا ہے۔

تیسرے ورق پر افضل صاحب کی اپنی ایک رباعی ہے جس میں تعلّی،خود آگہی اور خود شناسی کی ملی جلی کیفیت ہے ؎

گہوارۂ ہا و ہو بنایا میں نے
شائستہ گفتگو بنایا میں نے
غزلوں میں سمیٹ کر اودھ کی تہذیب
کلکتے کو لکھنؤ بنایا میں نے

میرا ذاتی خیال ہے کہ اس رباعی میں لکھنو کے حوالے کے تین اسباب ہو سکتے ہیں۔ پہلا سبب یہ ہے کہ افضل صاحب کے بنیادی استاد رنؔگ لکھنوی تھے۔ دوسرا یہ کہ لکھنؤ میں اردو زبان کی کنہیات پر فنی اور تخلیقی توانائی صرف کی گئی ہے،اس سے شعر وادب سے زیادہ زبان، بیان اور قواعد کی بوقلمونی کی تاریخ بنی ہے۔ تیسرا اور آخری سبب یہ ہوسکتا ہے کہ انیسویں صدی میں لکھنؤ تہذیب وشائستگی کا ایک پرشکوہ مرکز بن گیا تھا جس کی مثال اردو کے دوسرے مراکز میں نہیں ملتی ہے۔

اس بحث سے قطع نظر افضل صاحب کی شعری نگارشات کے جائزے سے عیاں ہوتا ہے کہ انہوں نے شاعری کی کئی صنفوں غزل،نظم (پابند اور آزاد)، قطعہ، رباعی، حمد،نعت، سلام،نوحہ،منقبت اور قصیدۂ رمضان وغیرہ پر اپنی تخلیقی توانائی صرف کی ہے۔ان اصناف میں غزلوں اور قطعات کی تعداد زیادہ ہے، اس لیے غزلوں کے مذکورہ دو مجموعوں کے بعد ۱۹۹۶ء میں قطعات کا مجموعہ ''قلم برداشتہ'' طبع ہوا۔اس مجموعے کو

اسم بامسمیٰ کہنا چاہئے۔اس میں بیشتر وہی قطعات ہیں جوموصوف روزانہ ''آزاد ہند''اور ہفتہ وار''اجالا'' کے لیے ایک عرصے تک لکھا کرتے تھے۔ان قطعات میں عصری سیاست،سماجی اتھل پتھل، عائلی مسائل، مسلکی اورخانگی اختلافات، سیاسی رہنماؤں کی شعبدہ بازی وغیرہ پر اظہارخیال کیا گیا ہے۔کبھی سپاٹ انداز میں اور کبھی طنزیہ ومزاحیہ لہجے میں۔ایک قطعہ دیکھئے ؂

رہنما اپنے گرم کمروں میں
چائے پیتے ہیں ، ٹوس کھاتے ہیں
ہم کھلے آسمان کے نیچے
اشک پیتے ہیں ، اوس کھاتے ہیں

افضل صاحب کی نثری تحریروں کا مجموعہ''خدوخال''۲۰۰۳ء میں شائع ہوا۔ ان کی نگارشات کا یہ آخری مجموعہ ہے۔اسے انہوں نے:

''جناب مدینۃ العلم اور جناب بابِ شہر العلم
کی بارگاہ میں''

معنون کیا ہے جس سے ان کے عقیدے اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت علی کرم اللہ وجہٗ کی ذات مبارکہ سے بے پایاں عقیدت مندی کا اظہار ہوتا ہے۔اگلے ورق پر ایک بہت عمدہ شعر پیش کیا ہے جس سے مقصد تحریر ظاہر ہو جاتا ہے ؂

عکس ابھرے تو بحث خد و خال ہو
آئینہ ذکر بے چہرگی کیا کرے

اس کے بعد ان کی اٹھارہ نثری تحریریں ہیں جنہیں انگریزی کا Write up سمجھا جا سکتا ہے۔سولہ تحریریں مختلف افراد کے شخصیاتی یا فنی خدوخال ابھارتی ہیں اور دو کا تعلق اردو اور بنگلہ ادب کے اہم گوشوں سے ہے۔ افضل صاحب کی وفات کے بعد نعیم انیس نے ان کے متنوع ومتفرق کلام (سلام،نوحے، ماتم، قصائد رمضان اور قطعات وغیرہ) کو ترتیب دے کر کلکتہ سے ۲۰۰۷ء میں شائع کیا۔

نگارشات کی اس تفصیل سے صرف نظر کرتے ہوئے اگر افضل صاحب کی غزل گوئی پر مختصر مکالمہ کیا جائے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ ان کی تخلیقی شخصیت کی بہترین جلوہ افروزی صنف غزل میں ہوئی ہے۔ ابتدا میں وہ کیسی غزلیں کہتے تھے، کلام ضائع ہو جانے کے سبب کچھ کہنا مشکل ہے۔شانتی رنجن بھٹاچاریہ نے جو غزل ڈھونڈ نکالی ہے، اس سے یہ ضرور ظاہر ہوتا ہے کہ افضل صاحب شروع ہی سے ایک ایسے غزلیہ طرز کی تلاش میں تھے جو دوسروں سے الگ ہو اور جس میں زبان وبیان کا حسن ہو، اگر کلکتہ یونیورسٹی کے ۱۹۵۸ء کے اس مشاعرے کی غزل کو بنیادی یا شعوری سطح پر بالیدگی کے بعد کی پہلی غزل مان لیا جائے تو یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ کم عمری میں انہوں نے اپنی انفرادیت کا مظاہرہ شروع کر دیا تھا۔استاد کی زمین میں کئی ایسے شعر نکالے تھے، جن میں تازگی بھی تھی اور تفکر بھی، حالاں کہ وہ عمر لاابالیوں اور حسن دلبراں سے حظ اٹھانے کی ہے۔ان کے استاد پرویزؔ شاہدی تصویر محبوب سے رومانی چھاؤں میں پناہ لیتے ہیں اور حسی پیکر تراشی کرتے ہوئے کہتے ہیں ؂

میں نے دیکھا ہے ترے حسن خود آگاہ کا رعب
اجنبی نظروں کو چہرے پہ بکھرنے نہ دیا

یہاں اظہار میں جو سرور اور سرمستی ہے، افضل صاحب اس سے کوسوں دور ہیں۔ان کی تربیت اور خاندانی شائستگی اور سنجیدگی انہیں روکے رکھتی ہے۔وہ اپنی باتیں سات پردوں میں کرتے ہیں اور غزل کو قدیم وجدید دونوں معنی کا عکاس بنا دیتے ہیں ؂

اتنی مدت تو رہا کس کس سے مصروفِ کلام
تیری خاموشی ترا پیغام پہنچاتی رہی

خرد بھی گوش بر آواز وقت تھی لیکن
پیام جتنے بھی آئے جنوں کے نام آئے

کبھی محبوب کی یاد ایک کسک بن کر متغزلانہ لَے میں ڈھلی بھی ہے تو ایک حد، ایک نظم وضبط کے ساتھ ؂

آج اک عمر پہ یوں دل نے تجھے یاد کیا
دفعتاً نیند سے جیسے کوئی پیاسا جاگے

ان کے یہاں قلبی کیفیت اور حسی لہر بڑی سادگی، متانت اور حسن کے ساتھ پیدا ہوئی ہے۔الفاظ کے استعمال پر انہوں نے کڑے پہرے بٹھا رکھے ہیں۔تہذیب اور تربیت کی مضبوط ڈور انہیں کھینچے رکھتی ہے، پھر

بھی ان کی فنکاری یہ ہے کہ اشاروں کنایوں کی نرم چھاؤں میں اپنے حسی تجربات سرعت سے بیان کر جاتے ہیں۔

افضل صاحب کوئی صوفی نہیں تھے۔ نظریاتی اور عملی سطح پر بیدار مغز اور ہوش مند انسان ضرور تھے۔ وہ اخلاقی اور انسانی قدروں کے امین تھے۔ راضی بہ رضائے الٰہی پر یقین رکھتے تھے۔ ہوا و ہوس سے دور رہنے کی جدوجہد کرتے تھے۔ اس ضمن میں کیا خوبصورت شعر کہا ہے ؎

دل کی دہلیز پہ شمشیر بکف بیٹھے رہو
کس کو معلوم کہ کب کوئی تمنا جاگے

اس شعر کی لفظیات کلاسیکی اردو شاعری سے ہم آہنگ ہے۔ لفظوں کی دروبست میں صوتی تکرار (Alliteration) ہے جس سے موسیقیاتی لہر اور نغمگی پیدا ہوتی ہے اور خیال کو موجزن کرتی ہوئی قاری یا سامع کے حواس پر چھا جاتی ہے۔ ایک نوع کی سحر انگیز کیفیت میں شعر کی مسرت آمیز تفہیم ہوتی ہے۔ بظاہر اس میں احساس جبر کا شائبہ بھی ہے تاہم تمنا کی بیخ کنی مفہوم تک پہنچنے میں معاون ثابت ہوتی ہے۔ ایک اور صوفیانہ شعر دیکھئے ؎

ایوانِ تصور میں اور اس کے سوا کیا ہے
آئینے ہی آئینے، حیرانی ہی حیرانی

اس شعر میں درون بینی کے اس عالم محویت کی طرف اشارہ ہے جہاں پہنچ کر کوئی فرد حیرت میں مبتلا ہو جاتا ہے اور اس کے دیدۂ دل سے کئی پردے اٹھنے لگتے ہیں، مشاہدوں سے حیران ہوتا ہے۔ یہ شعر مرحلہ تصوف سے منسلک ہے، مگر بیان ایسا تہہ دار اور دلفریب ہے کہ عام قاری ایوان تصور ہی تک محدود ہو جائے۔

افضل صاحب یہیں تک نہیں ٹھہرتے۔ آگے حقیقت کی منزل کا بھی خوبصورتی سے بیان کرتے ہیں اور بڑے اطمینان سے یہ اعلان کرتے ہیں ؎

صداقتوں کی رہگذر، طویل ہے نہ مختصر
یہ قرب و بعد اپنے اپنے حوصلے کا نام ہے

یہاں بھی فرد کے اس باطنی سفر کا گمان ہوتا ہے جس کے ذریعے وہ مجاز سے درجہ بدرجہ دور ہوتا ہے اور حقیقت کی روشنی سے ہمکنار ہوتا ہے۔ یہ سفر یقیناً فرد کے حوصلے، اس کی ریاضت اور اس کے ارتکاز پر منحصر ہے۔

یوں تو افضل صاحب کی شاعری پر کئی اچھے مضامین لکھے گئے ہیں۔ شعری مجموعوں پر تبصرے ہوئے ہیں، مگر ان میں ایسے اشعار سے بحث کی گئی ہے، جن کی بنت میں سماجی اور سیاسی افکار ہیں۔ انہوں نے خود بھی تسلیم کیا ہے کہ ان کی پوری شاعری مقصدی ہے۔ ناقدوں نے بھی ان کی سماجی بصیرت اور عصری شعور پر زیادہ توجہ دی ہے اور انہیں محض ترقی پسند بنا دیا ہے، لہٰذا میں نے ان کے ایسے اشعار تلاش کرنے کی سعی کی ہے جو ان کی تخلیقی شخصیت کی تکمیل کرسکیں۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ انہوں نے غیر شعوری طور پر ہی سہی کسی قدر عشقیہ اور عارفانہ شاعری بھی کی ہے۔ ان کی شاعری، بالخصوص غزلوں کے مختلف پہلوؤں کی چھان بین ہونی چاہئے۔ انہیں صرف ترقی پسند شاعر کہہ کر ایک مخصوص صف میں کھڑا کرنا قطعی مناسب نہیں ہے۔

اعزاز افضل ایک بڑے اور نامور شاعر ہیں۔ ان کی شاعری کے سارے Shades کو سامنے لانے کی ضرورت ہے۔ انہوں نے غزلوں اور نظموں کے علاوہ دوسری شعری اصناف میں بھی فنکاری کے نقوش ابھارے ہیں۔ بنگلہ اور انگریزی نظموں کے منظوم ترجمے کئے ہیں۔ اس لیے میری ناچیز رائے ہے کہ ان کی تمام شعری نگارشات اکٹھا کی جائیں۔ ''ان پڑھ آندھی'' مطبوعہ ۱۹۸۰ء کے بعد کی مطبوعہ و غیر مطبوعہ غزلیں جمع کی جائیں اور کلیات مرتب کی جائے تاکہ تنقید و تجزیے میں سہولت ہو نیز بیسویں صدی کی اردو شاعری کے حوالے سے ان کا جائز مقام و مرتبہ متعین کیا جا سکے۔ ❁❁

خریدار اور کرم فرما حضرات سے......

''زبان و ادب'' کی تازہ اشاعتیں، خریدار اور کرم فرما حضرات کے پتہ پر بروقت بھیج دی جاتی ہیں۔ پرچہ سادہ ڈاک سے روانہ کیا جاتا ہے۔ پرچہ کے تاخیر سے ملنے یا نہیں پہنچنے کی صورت میں، اپنے علاقہ کے ڈاکیہ اور مقامی ڈاک خانے سے رجوع کریں۔ ادارہ ڈاک میں پرچہ کی گم شدگی کا ذمہ دار نہیں۔

ڈاکٹر محمد قیام الدین
At /Po Bardaha, Via,Kamtaul, Dist- Madhubani -847304 (Mob.9973743606)

دل کے قریں رہتے ہیں: ایک جائزہ

احمد یوسف نے مختلف اصنافِ ادب مثلاً افسانے، ناولٹ، رپورتاژ، تنقید وتحقیق، ترجمہ خاکہ نگاری وغیرہ پر زورآزمائی کی ہے، لیکن ان کی مقبولیت افسانہ نگاری ہی کی وجہ سے ہے۔ ان کے افسانوں میں آزادی سے قبل اور آزادی کے بعد کے تجربے اور مشاہدے شامل ہیں۔ ظلم واستبداد اور استحصال کے خوفناک اور بھیانک چہرے بھی ان کے افسانوں میں نظر آتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے اپنے اردگرد، کوچہ وبازار کے قصے بھی بیان کئے ہیں۔ تین ناولٹ کا مجموعہ ''جلتا ہوا جنگل'' کے عنوان سے منظر عام پر آیا ہے، جن میں ناولٹ کی تمام خوبیاں موجود ہیں۔ دیگر کتابوں کے علاوہ انہوں نے ''بہار اردولغت'' کے نام سے ایک ڈکشنری بھی تیار کی ہے، جس کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے۔ جہاں تک ان کی خاکہ نگاری کی بات ہے تو انہوں نے کئی اچھے خاکے لکھے ہیں۔ ان کے خاکوں کا مجموعہ ''دل کے قریں رہتے ہیں'' ۲۰۰۷ء میں شائع ہوا تھا جس میں تیرہ خاکے اس طرح ہیں:

(۱) بزرگ محترم (فصیح الدین بلخی)
(۲) نامردانہ زیست کرتا تھا (ثاقب عظیم آبادی)
(۳) برق وشرر کو کیا ہوا (پروفیسر شاہدی)
(۴) پرکھ نہ پائے گا یہ لعل شب چراغ کوئی (اختر اورینوی)
(۵) مرشدی ومولائی (تقی رحیم)
(۶) پا پیادہ تھا، مگر راہ میں وہ دھوم مچی (حسن نعیم)
(۷) نہ کوئی لطف سماعت نہ کوئی لذت دید (مظہر امام)
(۸) مگر جہاں سے یہ بڑھ گیا...... (ظہیر صدیقی)
(۹) قصہ گو تھا فسوں طراز بھی تھا (غیاث احمد گدی)
(۱۰) زمانے کے سمندر سے نکلا گوہر فردا (کلام حیدری)
(۱۱) تو چہ دامن کہ دریں گرد سوار باشد (وہاب اشرفی)
(۱۲) میں نے اندھیری رات کو نجوم وقمر دیا (نادم بلخی)
(۱۳) میرے ابا (سید محمد یوسف)

ان کے کئی خاکے ''شاعر'' (ممبئی) ''آہنگ'' (گیا) ''مریخ'' (پٹنہ) اور ''زبان وادب'' (پٹنہ) جیسے رسائل میں شائع ہو چکے ہیں، چونکہ وہ افسانہ نگار تھے اس لئے ان کے خاکوں میں افسانوی رنگ ملتا ہے۔ اپنی باتوں کو کہنے کا سلیقہ انہیں اچھی طرح آتا ہے، جس کا اس اقتباس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے:

> ''اورینوی صاحب نے پہلے کمرے کے دروازے کے پاس جاکر سلام کیا اور پھر بڑی پرجوش اور فصیح تقریر کی، جس میں حضرات جن کو پرامن طور پر ہدایت کی گئی تھی اور اسلام کی تازہ روشنی کی خبر کی گئی تھی...... میں سمجھتا ہوں کہ یہی شخصیت دراصل ان کی بنیادی شخصیت ہے اور دوسری شخصیتیں محض عمارت بالائے عمارت کا درجہ رکھتی ہیں۔ یہ شخصیت ایسی ہے جو ساری قید وبند توڑ کر ان کی فنی تخلیقات میں بھی درآتی ہے۔ انہوں نے اپنے افسانے 'مریض' میں احمد کا کردار (جس کے سلسلے میں انہوں نے قاری کی ذہانت پر بھروسہ نہ کرتے ہوئے ایک عدد فٹ نوٹ لگا دیا ہے) بھی اسی تبلیغی اسپرٹ کے تحت پیش کیا گیا ہے۔ اختر صاحب افسانہ نگاروں کی اس نسل سے تعلق رکھتے ہیں جو پریم چند کے دور میں گزری تھی۔'' (اختر اورینوی ''دل کے قریں رہتے ہیں'' ص ۴۶)

مختلف واقعات اور منتشر یادوں کو یکجا کر کے پیش کرنے کا فن بھی وہ جانتے ہیں۔ ان کے خاکوں میں طنز ومزاح کی کیفیت بہت کم ہے۔ خاکہ نگار عام طور پر طنز ومزاح کے ذریعہ خاکے میں دلچسپی پیدا کرتے

ہیں، لیکن احمد یوسف کے یہاں طنز ومزاح کی پھلجھڑیاں شاذ ونادر ہی ملتی ہیں۔ وہ اپنے خاکوں میں متعلقہ شخصیت کی خوبیاں اور خامیاں دونوں پیش کرتے ہیں اور شعری وادبی کارنامے سے متعلق اپنی رائے کا اظہار بھی کرتے ہیں:

''تقی رحیم صاحب سے میری ملاقات ۱۹۶۱ء کے آس پاس ہوئی تھی۔ وہ میرے بھانجے شاہ نور الدین کے ساتھ مجھ سے ملنے میرے گھر آئے تھے۔'صنم' میں، میں ان کی کچھ تحریں پڑھ چکا تھا۔ جس سے میرے ذہن میں ایک نوجوان ادیب کا امیج بنا تھا، لیکن انہیں دیکھ کر یہ اندازہ ہوا کہ وہ چالیس، پینتالیس کی لپیٹ میں آچکے ہیں۔ میں نے ان سے کہا کہ میں تو آپ کو کم سن سمجھتا تھا۔ بعد میں انہوں نے شاہ نور الدین سے دریافت کیا کہ میں نے انہیں کم سن کہا تھا یا 'مسن' میرا خیال ٹھیک ہی تھا کیوں کہ ایک زمانے بعد انہوں نے بتایا کہ ان کی پیدائش ۱۹۱۹ء کی ہے۔'' ('دل کے قریں رہتے ہیں' ص ۵۲)

وہ گزرے ہوئے واقعات اس طرح دہراتے ہیں جیسے وہ آج کل ہی میں پیش آئے ہوں۔ اس سے ان کی قوت حافظہ کا بھی اندازہ ہوتا ہے:

''۱۹۳۳ء میں ان کی شادی 'پام ولا' ارول کی شکیلہ اختر صاحبہ سے ہوئی، جو ان کی قریبی رشتہ دار بھی تھیں۔ اس طرح وہ بہت سی نامی گرامی سالیوں کے دولہا بھائی بنے۔ اختر اور ینوی ارول سون کے کنارے بسی ایک خوبصورت سی بستی ہے۔ میں نے دریا کے کنارے بسنے والوں کے متعلق یہ سنا ہے کہ ان کے چہرے ہمیشہ کھلے رہتے ہیں۔ کم از کم یہ بات کاشی اور ارول کے باسیوں پر تو یقینی صادق آتی ہے...... ۱۹۳۴ء میں انگریزی آنرس کے پرچے دے رہے تھے کہ منھ سے خون آیا انہوں نے امتحان نہیں چھوڑا۔ خون روکنے کے لئے منھ میں برف کے ٹکڑے رکھے رہے۔ کئی دنوں تک صرف سنترے لیتے رہے۔ ایسے سخت مرحلوں سے گزر کر بھی انہوں نے پچھلی روایتوں کو قائم رکھا۔ بی۔اے میں امتیازی شان کے ساتھ کامیاب ہوئے اور گولڈ میڈل حاصل کیا۔''

(اختر اورینوی، دل کے قریں رہتے ہیں)

فصیح الدین بلخی پر انہوں نے جو خاکہ لکھا ہے اس کے مطابق ان کی پیدائش ۱۰ر فروری ۱۸۸۵ء میں ہوئی۔ تعلیم حاصل کرنے کے بعد پونہ یونیورسیٹی میں معلم رہے۔ فورٹ ولیم کالج میں معلّمی بھی کی۔ اس کے بعد جزیرہ فیجی کی عدالت عالیہ میں مترجم کی حیثیت سے بھی کچھ دنوں تک رہے۔ خرابی صحت کے باعث گھر واپس آگئے۔ وہ ترقی پسند تحریک سے جڑے ہوئے تھے۔ ان کی کئی کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ ان کا انتقال ۱۹۶۲ء کو ہوا۔

اس خاکے میں احمد یوسف نے فصیح الدین بلخی کے حیات اور کارناموں پر پوری روشنی ڈالی ہے۔ یہ پوری طرح سوانحی خاکہ ہے، مگر خاکے کے فکر وفن پر پوری طرح یہ خاکہ نہیں اترتا ہے، کیوں کہ اس میں طوالت سے کام لیا گیا ہے اور ان کی کتابوں پر بے جا روشنی ڈالی گئی ہے۔

احمد یوسف کے ایک مشہور ومقبول خاکہ ''برق وشرر کو کیا ہوا'' کے عنوان سے پرویز شاہدی کے فکر وفن پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس خاکے میں مصنف نے پرویز شاہدی کے تعلق سے جو باتیں کہی ہیں وہ بالکل دیکھی اور پرکھی ہوئی ہیں، لکھتے ہیں:

''پرویز نے عوام کے شانہ بہ شانہ چل کر بھیڑ سے گزر کر اور خانہ سلاسل کی سختیاں جھیل کر یہ گراں قدر تجربے حاصل کئے تھے جنہیں وہ اپنی تجربہ گاہ میں واپس آکر شاعری کے Beaker میں ڈھال دیتے تھے۔ ان کے والد سید احمد حسین صاحب کا شہر کے بڑے رئیسوں میں شمار ہوتا تھا۔ ان کی بہت بڑی زمینداری تھی۔ ۳۰۔۳۵ ہزار کی تحصیل تھی۔ بڑے دیندار تھے۔ صوفیوں اور مشائخ سے خاص عقیدت رکھتے تھے، لیکن دولت کا پرندہ کب کا اڑ چکا تھا اور اب گھر ویران تھا۔ چھتیں ویران تھیں اور گھر کا بڑا حصہ کھنڈر بن چکا تھا۔ انہیں دنوں انہوں نے 'روبیسن کو سلام'، 'تضاد' اور 'یا نگسی کو سلام'

لکھی تھی۔اس صحبت میں انہوں نے ان کے علاوہ کچھ پرانی چیزیں بھی گنائیں۔'' (دل کے قریں رہتے ہیں،ص ۳۶)

پرویزؔ شاہدی پر یہ خاکہ بے حد معلوماتی ہے۔اس کے مطالعے سے پرویزؔ شاہدی کی شاعری کو بھی سمجھا جاسکتا ہے۔

ثاقبؔ عظیم آبادی پر احمد یوسف کا خاکہ ''نامرادانہ زیست کرتا تھا'' ایک بہت ہی اچھا خاکہ مانا جاتا ہے۔خاکے کے فن پر یہ کھرا اترتا ہے۔اس کی ابتدا ہی اس انداز سے ہوئی ہے کہ قاری پڑھنے پر مجبور ہوجاتا ہے، لکھتے ہیں:

''......اور برس دو برس کوئی ایسے دن بھی نہیں ہیں کہ ثاقبؔ عظیم آبادی کی وضع قطع کو بھلا دیا جاتا۔ دونوں ہاتھ پیچھے کی جانب بندھے ہوئے، بند گلے کی قمیص، برکا پیجامہ، سرمنڈھی ہوئی پلے کی ٹوپی، پاؤں میں نیوکٹ جیسا کوئی جوتا، آگے کی طرف قدرے جھکے ہوئے...... آہستہ آہستہ چلتے ہوئے یہ بتاتے ہوئے کہ میں ساری زندگی اسی چال سے چلتا رہا ہوں اور اب زندگی کی شام آگئی ہے اور یہ وہ موڑ ہے کہ یہاں پہنچ کر نہ رفتار تیز کی جاسکتی ہے نہ رفتار سست کی جاسکتی ہے کہ دونوں میں چند در چند قباحتیں ہیں۔صحت یہ بتاتی تھی کہ جوانی میں بہت اچھے دن گزارے ہیں۔'' (دل کے قریں رہتے ہیں،ص ۲۵)

احمد یوسف نے اختر اورینوی پر جو خاکہ لکھا ہے اس کے مطالعے سے اختر اورینوی کے فکر وفن کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔وہ ایک بڑے افسانہ نگار، بلند پایہ محقق، بڑے نقاد، ڈرامہ نگار اور شاعر تھے۔انہوں نے بہت اچھے افسانے لکھے۔ان کے افسانے ہندو پاک کے اہم رسائل میں شائع ہوتے تھے۔ان کی زبان بھی دلچسپ اور دلنشیں تھی۔احمد یوسف ان کے بارے میں لکھتے ہیں:

''اختر صاحب کی پیدائش ۱۹/ اگست ۱۹۱۰ء کو کاکو میں ہوئی جوان کی نانیہال ہے۔آٹھ سال کے تھے کہ سخت طور پر ٹائی فائیڈ میں مبتلا ہوئے اور چالیس دن سرسامی کیفیت رہی۔پھر کالازار میں گرفتار ہوئے۔کچھ دنوں بعد رخسار کی ہڈیوں میں ناسور نکل آیا اور آپریشن کی ضرورت پیش آئی۔۱۹۲۶ء میں فرسٹ ڈویژن سے پاس ہوئے اور وظیفہ پایا۔پٹنہ میں آئی ایس سی جوائن کیا۔ہاتھ میں ٹیسٹ ٹیوب ہے۔ہیٹ اور الیکٹر یسیٹی سے شغل کررہے ہیں۔طشت میں ایک شیر دل مینڈک چت پڑا ہے اور یہ ہیں کہ پھول کی پتیوں کو نوچ کر اسے بے حجاب کررہے ہیں۔'' (دل کے قریں رہتے ہیں،ص ۴۳)

یوں تو احمد یوسف کے سبھی خاکے اچھے ہیں۔انہوں نے اس سلسلے میں خود ہی لکھا ہے کہ جب ۱۹۶۵ء کے آس پاس الٰہ آباد سے ''شب خون'' کا اجرا ہوا تو ہم میں ایک نئی اسپرٹ آگئی۔ایک نیا دور شروع ہو۔ظہیر صدیقی اور وہاب اشرفی اسی دور کے لوگ تھے۔غیاث احمد گدی پرانے لوگوں میں تھے، لیکن ان کی پہچان اسی دور میں ہوئی۔وہاب اشرفی اسی زمانے میں ''صنم'' نکال رہے تھے۔

''میرے ابا'' پچھلی صدی کے فرد تھے، لیکن میں نے ہمیشہ یہ محسوس کیا کہ ہم انہیں کسی خاص عہد میں مقید نہیں کرسکتے۔

......وہ جو دل کے قریب رہتے ہیں

فصیح الدین بلخی

ثاقبؔ عظیم آبادی

احمد یوسف

پرویز شاہدی

اختر اورینوی

اردو کے حالات بہتر ہوئے تو ہمیں یقین ہے کہ آنے والے دنوں میں ایسے لوگ آئیں گے جو تازہ دم ہوں گے اور جن کے متعلق ہم یہ کہیں گے کہ وہ سوچنے سمجھنے اور لکھنے کی اعلیٰ صلاحیت رکھتے ہیں۔

ان کے خاکہ ''میرے ابا'' پر مختصر روشنی ڈال دینا ضروری سمجھتا ہوں۔ یہ خاکہ بے حد اہم خاکہ ہے۔ انہوں نے اپنے والد سید محمد یوسف کا خاکہ پیش کیا ہے۔ اس خاکے کو انہوں نے شروع اس انداز سے کیا ہے کہ قاری متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا:

''دراصل ماضی پر اتنی دھند چھائی رہتی ہے کہ سارے چہرے، سارے مناظر ساری یادیں اور سارے واقعات آپس میں اس طرح مل جل جاتے ہیں کہ کوئی چہرہ نہ صاف نظر آتا ہے نہ کوئی منظر اپنی ساری دلکشی کے ساتھ سامنے آتا ہے۔ نہ کوئی یاد واضح طور پر ذہن کے پردے سے برآمد ہوتی ہے اور نہ کوئی واقعہ پورے خط وخال کے ساتھ دکھائی دیتی ہے، لیکن حد درجہ کی قربت اور خون کے رشتے کچھ ایسے ہوتے ہیں کہ ماں باپ دادا، دادی، نانا، نانی اور بھائی بہنوں کی صورتیں یادوں کے سارے دھند لکے سے خود نکل کر ہمارے سامنے آ ہی جاتی ہیں۔''

(دل کے قریں رہتے ہیں، ص ۲۰۱)

انہوں نے اس خاکے میں اپنے والد کی تمام خوبیوں کا ذکر کیا ہے کہ وہ کس طرح پڑھتے لکھتے تھے۔ ان کے لکھنے پڑھنے کا کیا انداز تھا۔ احمد یوسف کی زبان کیسی تھی اس خاکے کے اقتباس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے:

''شیروانی ٹوپی میں ملبوس، ملگجے لباس، بڑھی ہوئی داڑھی اور بے ترتیبی کی مثال بنے ہوئے وہ ایک نگاہ سے ہی دل میں کیسے اترتے اور رہی سہی کسر ان کے لب و لہجے سے پوری ہو جاتی۔ دراصل وہ سیاست کے آدمی تھے ہی نہیں، غلطی سے اس میدان میں اتر گئے تھے، لیکن وفاداری بشرط استواری کی عملی مثال بنے ہوئے رہے۔ نہ تو کبھی پالا بدلا اور نہ اسے ذاتی منفعت کا ذریعہ ہی بنایا۔ اپنی ایک خاص روش پر گامزن رہے۔ کچھ دنوں اقلیتی کمیشن کے صدر نشیں رہے، وہ بھی اس لیے کہ وہ ایک بے داغ کردار کے حامل تھے۔ کسی ظاہری عہدے کے لیے انہوں نے خود کو پیش کیا نہ کوئی پیروی کی۔''

(تقی رحیم 'دل کے قریں رہتے ہیں)

احمد یوسف نے زیادہ تر خاکے ایسی شخصیتوں پر لکھے ہیں جنہوں نے اردو شعر و ادب میں نمایاں مقام حاصل کر لیا ہے۔ ان کے کچھ خاکوں میں فنی کمزوریاں بھی ہیں، لیکن زیادہ تر خاکے خاکہ نگاری کے فن پر پورے اترتے ہیں۔ ان کا خاکہ پڑھ کر قاری کے دل میں یہ بات پیدا ہوتی ہے کہ خاکہ کے مطالعہ کا مقصد پورا ہوا۔ ساتھ ہی اچھی شخصیتوں سے صحبت کا موقع ملا۔ احمد یوسف نے جن پر خاکہ لکھا ہے ان کے داخلی اور خارجی دونوں پہلوؤں پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ انہوں نے اپنے خاکوں میں ایک ہی طرح کے افراد کو پیش نہیں کیا ہے بلکہ ہر طرح کے لوگوں کو چنا ہے، لیکن ان میں سے بیشتر اعلیٰ تعلیم یافتہ اور شعر و ادب میں بلند و بالا مقام حاصل کرنے والے ہیں۔ خاکہ نگاری کے لیے بھی احمد یوسف ہمیشہ یاد کئے جاتے رہیں گے۔

❀❀❀

......وہ جو دل کے قریں رہتے ہیں

حسنؔ نعیم

مظہر امام

غیاث احمد گدی

کلام حیدری

وہاب اشرفی

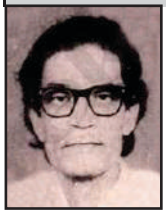
نادم بلخی

ڈاکٹر احسان عالم

"Ahmad Complex" Near Al-Hira Public School, Moh. Raham Khan, P.o. Lalbagh
Darbhanga - 846004 (Mob. 9431414808)

پروفیسر عبدالمغنی کی تنقیدی شناخت

ڈاکٹر عبدالمغنی کثیر الجہات انسان تھے۔ان کی ادبی خدمات کا دائرہ وسیع ہے۔انہوں نے ایک وسیع المطالعہ اور باخبر تنقید نگار کی حیثیت سے اپنی شناخت قائم کی اور ادبی صحافت کے میدان میں بھی اپنے نقوش چھوڑے۔انہوں نے ماہنامہ ''مریخ'' ۱۹۶۸ء میں جاری کیا اور اپنے انتقال سے چند سال پہلے تک اپنی ادارت میں اسے شائع کرتے رہے۔ انہوں نے اسلامی تعلیمات اور ملی مسائل وموضوعات پر اردو میں بے شمار مضامین لکھے جو اخباروں اور رسالوں میں چھپے۔اردو زبان کی ترقی اور اشاعت کے لئے ''انجمن ترقی اردو بہار'' کے صدر کی حیثیت سے اردو تحریک کی کامیاب قیادت کی، جس کے نتیجے میں ۱۹۸۰ء میں حکومت بہار نے اردو کو ریاست بہار کی دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیا اور بے شمار مترجمین ومعاون مترجمین بحال ہوئے۔ پروفیسر عبدالمغنی کی کوششوں کے نتیجے میں پٹنہ شہر کے قلب میں ''اردو بھون'' کی تعمیر ہوئی۔ بے شمار شخصیات وموضوعات پر انہوں نے مضامین لکھے اور اپنی انشاپردازی اور عالمانہ خیالات کا لوہا منوایا، لیکن ان کی ادبی خدمات کا سب سے روشن پہلو ان کی تنقید نگاری ہے۔

پروفیسر عبدالمغنی نے اپنی طالب علمی کے زمانے ہی سے ادبی موضوعات پر مضامین لکھنا شروع کردیا تھا۔۱۹۵۷ء سے ان کے مقالات ہندو پاک کے مقتدر رسالوں میں شائع ہونے لگے اور ان کے تنقیدی مضامین کے مجموعے تسلسل وتواتر سے طبع ہوکر منظر عام پر آنے لگے، چنانچہ ان کے مندرجہ ذیل دس مجموعے چھپے:

''نقطہ نظر''، ''جادۂ اعتدال''، ''تشکیل جدید''، ''معیار و اقدار''، ''تنقید مشرق''، ''تصورات''، ''اسلوب تنقید''، ''تنقیدی زاویے''، فروغ تنقید'' اور ''انداز تنقید''

تنقیدی مضامین کے ان مجموعوں میں کل ایک سو تہتر مضامین ہیں۔ان کے علاوہ عبدالمغنی کے بے شمار مضامین مختلف رسالوں، اخباروں، جریدوں اور مضامین کے مجموعوں میں بکھرے ہوئے ہیں۔

پروفیسر عبدالمغنی نے جس وقت تنقید نگاری شروع کی اس وقت چاروں طرف ترقی پسند نظریات کا غلغلہ بلند ہو رہا تھا۔عبدالمغنی نے اشتراکی نظریات اور ترقی پسند افکار کی انتہائی مقبولیت وعروج کے زمانے میں اختلاف وانحراف کی راہ اختیار کی۔ترقی پسند ناقدوں کی تحریروں کا دوٹوک مطالعہ پیش کرتے ہوئے انہوں نے ان کے افکار و نظریات کی تردید و تغلیط کی اور اخلاقی اقدار اور مذہبی افکار وتصورات کا پرچم بلند کیا اور بڑی مضبوطی سے اپنے موقف کی مسلسل وضاحت و صراحت کرتے رہے۔

عبدالمغنی صاحب نے فارسی و اردو کے کلاسیکی اور صف اول کے شاعروں اور فنکاروں کی تخلیقات کا مطالعہ کرکے ادب وشاعری کا ایک معیار اخذ کیا تھا۔ بظاہر وہ مولانا شبلی کے نظریۂ ادب کے متبع معلوم ہوتے ہیں، لیکن انہوں نے اردو، فارسی اور انگریزی کے اعلیٰ ادب پاروں کا کیا مطالعہ کیا تھا اور انہیں کی روشنی میں شعر وادب سے متعلق اصول و نظریات قائم کئے تھے۔فکری سطح پر وہ مولانا شبلی کے علاوہ مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی تحریروں کے گرویدہ اور اقبالؔ کی شاعری اور فکر کے عاشق تھے، لیکن اقبالؔ کو سب سے بڑا شاعر ماننے کا یہ مطلب نہیں سمجھتے تھے کہ دوسرے شاعروں کی خوبیوں کا انکار کردیں۔ وہ جگر مرادآبادی اور مجروحؔ سلطان پوری کی غزلیہ شاعری کو بھی قابل قدر سمجھتے تھے اور انہیں اردو شاعری کی بہترین روایات سے ہم آہنگ پاتے تھے۔ان دونوں غزل گو شعرا پر ان کے مضامین اس بات کے گواہ ہیں۔

عبدالمغنی نے فیضؔ اور فراقؔ کی شاعری کے محاسن کا کھلے سے دل سے اعتراف کیا اور ساتھ ہی ان کی شاعری کے حدود کی نشاندہی بھی کردی۔

ڈاکٹر عبدالمغنی کے زمانے ہی میں اردو میں جدیدیت کی تحریک اٹھی۔ اس تحریک اور نظریۂ ادب سے وابستہ ادیبوں اور شاعروں نے علامت، ابہام اور تجرید کے نام پر افسانہ اور شاعری کو معمہ و چیستاں بنادیا۔ اس گروہ کے ناقدوں اور فنکاروں نے شعروادب کے سماجی و اخلاقی سروکار کا صاف انکار کیا۔ عبدالمغنی نے ان ناقدوں اور فنکاروں کی بے سمتی و بے جہتی، ابہام وجدت طرازی کی مہملیت واضح کی اور ان کے مضر اثرات سے ادیبوں، شاعروں اور قارئین ادب کو مطلع ومتنبہ کرتے رہے۔ جدیدیت کے زیر اثر اُس دور میں جو افسانے لکھے جاتے رہے تھے اور ''شب خون'' وغیرہ رسالوں میں شائع ہو رہے تھے، ان میں قصہ پن بالکل نہیں تھا۔ ساتھ ہی ساتھ ان میں فلسفیانہ انشاء پردازی اور بےضرورت و بےمحل شاعرانہ انداز بیان پایا جاتا تھا۔ علامتوں کے سہارے گفتگو ہوتی تھی، افسانے کا سمجھنا کار محال ہوگیا۔ نتیجتاً اردو افسانے کا قاری عنقا ہوگیا۔ اس صورت حال نے نہ صرف افسانے کی مقبولیت ومعنویت پر ضرب لگائی بلکہ اردو زبان کی ریڈرشپ کو بھی شدید نقصان پہنچایا۔ پروفیسر عبدالمغنی نے ایسی افسانہ نگاری کا سخت محاسبہ کیا اور باماجرا افسانہ کی تعریف وتوصیف کی۔ وقت نے ثابت کردیا کہ ڈاکٹر عبدالمغنی کا موقف درست تھا۔

ڈاکٹر عبدالمغنی نے ادب میں اخلاقی اقدار کی اہمیت پر زور دیا۔ اس سبب سے اردو کے بہت سے شاعر و ادیب ان کی تنقیدی نگارشات کو ''مولویانہ'' کہہ کر مسترد کرتے رہے ہیں، حالاں کہ یہ نہایت قابل اعتراض اور غلط رویہ ہے۔ اہل نظر جانتے ہیں کہ شعروادب کا یہ وہ موقف ہے جس کو دنیا کے عظیم فنکاروں نے اختیار کیا۔ رومیؔ، سعدیؔ، ٹالسٹائی، حالیؔ، شبلی، اقبالؔ اور ٹی ایس ایلیٹ وغیرہ نے اس موقف پر اصرار کیا اور اس کو اختیار کرکے اعلیٰ ادب پاروں کی تخلیق کی جن کی معنویت ومحاسن کا ایک زمانہ قائل ہے۔ عبدالمغنی نے اخلاقی قدروں پر تاکیدی نشان لگا کر ادب اور تہذیب کے مسلمات ومعروضات کی نشاندہی کی تاکہ ادب وشاعری انسانیت کے لئے مفید ونافع ہو، مضر اور باعث خسران نہ ہو۔ انہوں نے معترضین کے اعتراضات کا جواب مندرجہ ذیل لفظوں میں دیا اور اپنے نظریۂ ادب کی اس طرح وضاحت فرمائی:

> ''میرا تصور تنقید یہ ہے کہ زندگی اور ادب دونوں کو اپنی اپنی جگہ ایک کل اور ایک دوسرے کے ساتھ مربوط سمجھ کر پارۂ فن کا تجزیہ وتبصرہ اس انداز سے کرنا چاہئے کہ فن کے تمام عناصر ولوازمات کی پوری تصویر ابھرے اور ساتھ ہی ادب اور زندگی کی اصلیت وعظمت کی قدریں نکھریں اور سنوریں......اس اسلوب تنقید کو میں 'اخلاقی' کہتا ہوں اور اس کے بارے میں میرا نقطہ نظر یہ ہے کہ یہ زندگی اور ادب دونوں کی سالمیت اور ہم آہنگی کا ضامن ہے۔ اس میں جسم و روح اور فکر وفن دونوں کا کامل توازن پایا جاتا ہے۔ یہ ایک جادۂ اعتدال ہے اور اس معیار کامل پر دوسرے تمام اسالیب کی نیم صداقتوں کو بھی خام مواد اور وسائل کار کے طور پر جمع کیا جاسکتا ہے......
>
> ان مبصرین کی نکتہ چینیوں کا ماحصل یہ ہے کہ میرا ادبی نقطہ نظر قدامت پرستی، مذہبیت اور اسلامیت سے متصف ہے۔ واقعہ تو یہ ہے کہ ان الزامات کو تسلیم کر لینے سے مجھے ذاتی طور پر کوئی عار نہیں، اس لئے کہ مجھے نہ تو جدید ہونے کا کوئی شوق ہے اور نہ میں دہریت کو پسند کرتا ہوں، جب کہ اسلام پسند ہونے پر مجھے فخر ہے۔''

ڈاکٹر عبدالمغنی کی جملہ تحریروں خصوصاً تنقیدی مضامین کا سب سے نمایاں وصف ان کی عالمانہ شان اور دوٹوک انداز گفتگو ہے۔ عبدالمغنی کی تنقید میں ایک طنطنہ، شان وشکوہ اور کج کلاہی ضرور پائی جاتی ہے۔ ان کا

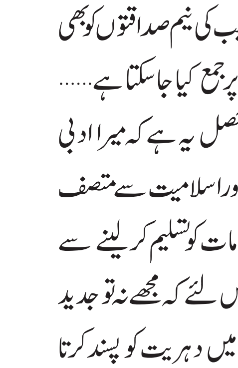

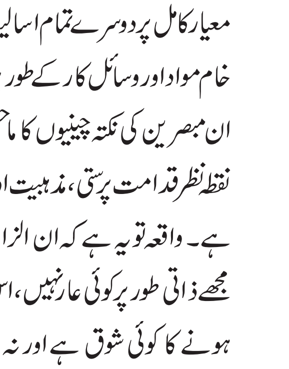

مخصوص نقطہ نظر اوران کی اسلامیت ان کی تحریروں میں صاف نظر آتی ہے۔ وہ جب اقبالؔ پر کلیم الدین احمد کے اعتراضات کا جواب دیتے ہیں تو ان کی تنقید میں مناظرے اور مباحثے کا انداز پیدا ہو جاتا ہے۔

عبدالمغنی صاحب کے یہاں مباحثہ ومناظرہ (Debate) خالص علمی سطح پر ہے۔ کلیم الدین احمد یا کسی اور ناقد کی اصولی و منطقی تردید کی گئی ہے۔ ذاتیات پر اوچھے حملے یا عالمانہ سطح سے نیچے گری ہوئی کٹھ بحثی نہیں پائی جاتی۔ کلیم الدین احمد، آل احمد سرور اور احتشام حسین سے اختلاف کے باوجود ان ناقدوں کی خوبیوں کا عبدالمغنی نے اعتراف کیا ہے۔ یہاں صرف یہ اقتباس بطور نمونہ پیش کیا جاتا ہے:

> ''مجموعی اور عمومی طور پر آل احمد سرور کی تنقید نگاری نے اردو ادب میں صحیح ذوق کی پرورش کی اور تہذیبی قدروں کی اشاعت کا سامان بڑے پیمانے پر کیا ہے۔ ان کی تنقید کو تخلیقی تنقید بھی کہا جا سکتا ہے۔ اس سلسلے میں ان کا اسلوب نگارش بہت دلکش، مسرت انگیز اور بصیرت افروز ہے۔ وہ سخن فہم اور نکتہ داں ہیں۔ ان کی نکتہ سنجیاں خیال انگیز ہیں۔ تنقید کے لئے ایسی تخلیقی نثر موزوں اور موثر ہے، اس سے ناقد کے اظہار و بیان کی عمدگی اور نفاست کے علاوہ فنکار کے ذہن کی تہیں اور باریکیاں بھی ایک حکیمانہ تجزیے کی بدولت آشکار ہوتی ہیں۔''
>
> (اندازتنقید،ص ۹۵)

جب کہ عبدالمغنی پروفیسر آل احمد سرور کی کوتاہیوں کی گرفت اسی مضمون میں اس طرح کرتے ہیں:

> ''ان کے تنقیدی تصورات میں بعض اوقات مصالحت کی ایسی کوشش کا سراغ بھی ملتا ہے جس کو مصلحت اندیشی کہا جاتا ہے۔ ایک طرف 'ادب اور نظریہ' کے دیباچے میں وہ کہتے ہیں: ہر ایک اچھی تنقید ادب کی بقا اور ترقی کے لئے کچھ سماجی، اخلاقی اور جمالیاتی قدروں پر زور دیتی ہے، اس کے لئے انسانیت اور تہذیب کا ایک جامع شعور درکار ہے۔ دوسری طرف، نظر اور نظریے کے پیش لفظ 'چند سطریں' میں ادب کے متعلق فرماتے ہیں۔ 'یہ نظریہ نہیں، نظر بخشتا ہے۔' ادب کی تاثیر میں نظریے کی مطلق نفی معیار نظر کے ساتھ ایسا مجھوتہ ہے جس سے دانشوری پر حرف آتا ہے اور دانشمندی کے تصور پر ضرب پڑتی ہے، چنانچہ نظریاتی وکالت کو سرور نے جو دانشوری کے دائرے سے خارج کیا ہے وہ درحقیقت تنقید کے بعض گوشوں میں خود ان کی دانشوری میں خامی کی دلیل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ مغربیت سے مرعوب ہوکر کلاسیکی روایات سے جدیدیت کے غلط انحرافات کی تائید کرتے نظر آتے ہیں۔'' (اندازِ تنقید،ص ۹۴و ص ۹۵)

کلیم الدین احمد کے خیالات سے ہزار اختلافات کے باوجود ڈاکٹر عبدالمغنی نے ان کی خدمات کا اعتراف کیا ہے۔ اپنے پہلے مجموعہ مضامین ''نقطہ نظر'' میں انہوں نے کلیم الدین احمد کی تنقید نگاری پر لکھتے ہوئے ان کی تنقید کے مثبت و منفی دونوں پہلوؤں کا ذکر کیا تھا۔ اردو تنقید کے مسائل پر ایک انٹرویو دیتے ہوئے انہوں نے کلیم الدین احمد کی تقنید کے بعض مثبت پہلوؤں کا ذکر مندرجہ ذیل لفظوں میں کیا:

> ''میں بعض وجوہ سے ان (کلیم الدین احمد) کو اردو ادب کا عصر حاضر میں اہم ترین نقاد سمجھتا ہوں، اس لئے ان کی غلطیوں پر میں سختی سے گرفت کرتا ہوں تاکہ غلط تنقیدی خیالات لوگوں کے درمیان بہت زیادہ نہ پھیلیں اور پڑھنے والوں پر ان کی غلطی واضح ہو جائے۔ جہاں تک کلیم الدین احمد کی تنقید کے مثبت پہلوؤں کا تعلق ہے ان میں سب سے اہم چیز یہ ہے کہ جس وقت ترقی پسندوں کا غلغلہ بلند تھا اور ادب پر ایک طرح کی یلغار ہو رہی تھی، ادب کو معاشیات سے آگے بڑھ کر سیاسیات کا ایک شعبہ بنانے کی کوشش کی جا رہی تھی، اس وقت جس نے غلط کاروں کی سب سے زیادہ تنبیہ کی، وہ کلیم الدین احمد کی تنقیدوں نے کی۔ اردو تنقید میں یہ ایک بہت بڑا کارنامہ ہے جو انہوں نے انجام دیا اور کہنا چاہئے کہ شاید

اپنے وقت میں تن تنہا انجام دیا۔ اس وقت ایک نقار خانہ تھا اور ان کی آواز طوطی کی آواز تھی، لیکن بعد میں کلیم الدین احمد اس حد تک کامیاب ہوئے کہ خود ترقی پسندوں کو اپنی بے راہ روی کا احساس ہوا اور ان کے اندر قدرے اعتدال پیدا ہونے لگا...... اس سے متصل ایک نکتہ یہ ہے کہ ترقی پسند 'فن' کو ایک حد تک نظر انداز کر کے سارا زور 'فکر' پر دے رہے تھے۔ کلیم الدین احمد نے گویا توازن قائم کرنے کے لئے 'فن' پر زور دیا۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں فکر و فن کے درمیان ارتباط ہونا چاہئے۔ یہ صحیح ہے کہ کلیم الدین احمد نے فن پر ضرورت سے زیادہ زور دیا ہے اور فن کی اہمیت اور ہیئت کی اہمیت میں مبالغہ آرائی کی ہے، لیکن یہ مبالغہ ایک دوسرے مبالغہ کے مقابلے میں تھا کہ اس سے کچھ توازن پیدا ہو۔ کلیم الدین احمد کی تنقید کے مثبت پہلو کے سلسلے میں ایک بات اور کہ انہوں نے جو سلوب بیان اختیار کیا گرچہ وہ بہت شاندار نہیں ہے، لیکن اس میں (انہوں نے) وضاحت اور تعین کے ساتھ اظہار خیال کی کوشش کی ہے۔ انہوں نے شاعرانہ یا فلسفیانہ قسم کی انشاپردازی کرنے کے بجائے بالکل واضح، صریح اور متعین نثر لکھی۔''

(ماخوذ از انٹرویو، بتاریخ ۶ / اپریل ۱۹۸۹ء مطبوعہ ماہنامہ ''پیش رفت''، دہلی، شمارہ دسمبر ۲۰۱۰ء، ص ۱۰ و ص ۱۱)

ڈاکٹر عبدالمغنی نے تقابلی تنقید کے بھی عمدہ نمونے پیش کئے، مثلاً اقبالؔ کی نظم ''لالۂ صحرا'' کا تقابلی مطالعہ عبدالمغنی کی تصنیف ''اقبالؔ کا نظام فن'' میں ملاحظہ فرمائیے۔ اس نظم کے مطالب و محاسن کی نہایت عالمانہ تشریح و تعبیر اس طرح کی گئی ہے کہ ان کی عمیق نگاہ اور باریک دقیقہ سنجی کی داد دینا پڑتی ہے۔ انہوں نے انگریزی کے مشہور شاعر ورڈس ورتھ کی نظم "The Daffodils" کا موازنہ اقبالؔ کی نظم ''لالۂ صحرا'' سے کیا ہے اور اس مطالعے کو پڑھ کر دیکھنے والی نگاہ دیکھ لیتی ہے کہ اقبالؔ کی نظم اپنی معنویت اور شعری محاسن کے اعتبار سے ورڈس ورتھ کی مذکورہ نظم سے بہ درجہا بہتر و برتر ہے۔

ڈاکٹر عبدالمغنی نے عملی و نظری تنقید کا جو سرمایہ چھوڑا ہے وہ اپنی کیفیت اور کمیت دونوں اعتبار سے وقیع ہے۔ ''افسانہ میں تکنیک کی اہمیت''، ''ڈرامانگاری''، ''جدید ادبی مسائل''، ''ادب کی پہچان''، ''شاعری کی تشکیل جدید''، ''ادبی تشکیل جدید''، ''ادبی تشکیل جدید کے اسباب و عوامل''، ''فن اور ناقد''، ''ادب میں وابستگی کا تصور''، ''ادب کا تعمیری مقصد''، ''صالح ادب اور تہذیب و ادب کی وابستگی''، ''ادب میں نظریے کی اہمیت''، ''فکر و فن''، ''افسانے میں ہیئتی تجربے''، ''غزل مہذب ترین صنف شاعری''، ''ادب میں ظرافت کی اہمیت اور اس کے عناصر''، ''ہم عصر افسانوں میں اقدار کی اہمیت''، ''نثری نظم اور آزاد غزل''، ''جدید ادبی تنقید کے مسائل''، ''ظریفانہ ادب اور تنقید معاشرہ''، ''ادب کا مواد اور موضوع''، ''ڈراما اور تھیٹر''، ''جدید و قدیم کا فریب'' وغیرہ ــــــ یہ چند عنوانات ہیں جن پر نظری تنقید کے باب میں عبدالمغنی کے مبسوط و مدلل مضامین ان کے تنقیدی مجموعوں میں پائے جاتے ہیں۔ انہوں نے جس اعتماد اور عالمانہ سنجیدگی سے نظری تنقید کے باب میں مضامین و مقالات لکھے اسی اعتماد و وسعت مطالعہ اور ذمہ داری کے ساتھ عملی تنقید کے نمونے بھی پیش کئے۔

عبدالمغنی کی تنقیدی نگارشات میں متنوع موضوعات و شخصیات پر مضامین ملتے ہیں۔ وہ ماہر تنقید نگار ہیں۔ انہوں نے شاعری اور شعرا کی تنقیدیں لکھیں تو افسانے اور ناول کی تنقیدیں بھی لکھیں۔ حیات اللہ انصاری، قرۃ العین حیدر، کشمیری لال ذاکر کی ناول نگاری پر ان کے مضامین اور ان کی کتابیں موجود ہیں۔ انہوں نے سہیل عظیم آبادی، شین مظفر پوری، اختر اورینوی اور غلام عباس کی افسانہ نگاری کا جائزہ لیا اور ان کے فن کے نقوش متعین کئے۔ ابوالکلام آزاد کے اسلوب نگارش پر ان کی کتاب عالمانہ و فاضلانہ انداز گفتگو کے لئے اس موضوع پر اہم تصنیف ہے۔ پروفیسر عبدالمغنی نے جہاں قدیم و کلاسیکی شعرا پر لکھا، وہیں جدید شاعروں اور ادیبوں پر بھی اظہار خیال کیا۔ حسرتؔ موہانی، فراقؔ گورکھپوری، عبدالعزیز خالدؔ، سیمابؔ اکبرآبادی، نسیمؔ حجازی، سکندر علی وجدؔ، جگن ناتھ آزادؔ، کلیم عاجزؔ، جمیلؔ مظہری کی شاعری پر ان کے مضامین

عملی تنقید کے اعلیٰ نمونے ہیں۔
ڈاکٹر عبدالمغنی نے اردو ادب کا جو دور دیکھا وہ مختلف تحریکات ورجحانات اور بڑے بڑے فنکاروں اور ناقدوں کا دور تھا۔ تنقید میں ایک طرف احتشام حسین، محمد حسن اور قمر رئیس کا سکہ چلتا تھا تو دوسری طرف جدیدیت کے قافلہ سالار شمس الرحمٰن فاروقی اور ان کے ہم نواؤں اور ہم خیالوں کا طوطی بولتا تھا۔ ان آوازوں کے درمیان کلیم الدین احمد کی ایک آواز بھی تھی۔ وہ مغربی شعروادب کے مطالعے کی روشنی میں اردو شعروادب اور تنقید کے پورے سرمایے کو کم حیثیت و کم مایہ ثابت کررہے تھے۔ ان آوازوں کے شوروغوغا میں ایک معتدل و منفرد آواز پروفیسر عبدالمغنی کی تھی جو ادب میں اعتدال و توازن اور اعلیٰ انسانی اقدار کا علم بلند کررہے تھے۔

عبدالمغنی کی تنقید نگاری سے متعلق ادب کے جغادری ادیبوں نے کم لکھا ہے، لیکن منصف مزاج اور باخبر ادیبوں اور ناقدوں نے ان سے متعلق بہت عمدہ رائے قائم کی ہے۔ عبدالمغنی صاحب کی حیات ہی میں سید احتشام حسین، سید صباح الدین عبدالرحمٰن اور نعیم صدیقی نے ان کی تنقید نگاری سے متعلق اظہار خیال کیا تھا، پھر ڈاکٹر سید احمد قادری نے سہ ماہی ''ادبی نقوش'' گیا کا ''پروفیسر عبدالمغنی نمبر'' شائع کیا، جس میں عبدالمغنی کی شخصیت اور تنقید نگاری پر معروف قلم کاروں اور باخبر ادیبوں کے عمدہ مضامین شامل کئے۔ اس شمارہ میں رضا نقوی واہی، ڈاکٹر سید احمد قادری، نعیم صدیقی، طیب عثمانی ندوی، محمد سالم، بدؔر اورنگ آبادی، ڈاکٹر اعجاز علی ارشد، ڈاکٹر شاداب رضی کے مضامین ہیں۔

عبدالمغنی نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز مذہبی مضامین اور انشائیوں سے کیا جو ۱۹۴۹ء تا ۱۹۵۳ء مختلف رسالوں میں شائع بھی ہوئے۔ پہلا تنقیدی مضمون ''۱۹۵۲ء کی بہترین غزل'' کے عنوان سے روزنامہ ''ساتھی'' پٹنہ کے ادبی ہفتہ وار ایڈیشن میں شائع ہوا۔ اس کے بعد ''اردوادب'' علی گڑھ ''نقوش'' لاہور ''معارف'' اعظم گڑھ ''آج کل'' دہلی اور ہندوپاک کے دوسرے مستند ادبی رسالوں میں ان کے تنقیدی مضامین شائع ہوتے رہے۔ اب تک ان کے تنقیدی مضامین کے چار مجموعے ''نقطۂ نظر'' (۱۹۶۵ء) ''جادۂ اعتدال'' (۱۹۷۲ء) ''تشکیل جدید'' (۱۹۷۶ء) و ''معیار واقدار'' (۱۹۸۱ء) زیور طبع سے آراستہ ہوکر منظر عام پر آچکے ہیں۔ برنارڈ شا، اختر اورینوی کے افسانے (ترتیب مع مقدمہ) اور سلور کنگ (ترتیب) وغیرہ بھی ان کے ادبی کارنامے ہیں۔ ''اقبال اور عالمی ادب'' کے عنوان سے ایک مبسوط کتاب کے بعض اجزا دیکھنے کا مجھے موقع ملا اور میں نے محسوس کیا کہ یہ کتاب عالمی ادب میں اقبالؔ کا مقام متعین کرنے کی ایک کوشش کے علاوہ ایک نہج سے کلیم الدین احمد کی کتاب ''اقبال ایک مطالعہ'' کا جواب بھی ہے۔

عبدالمغنی کے تنقیدی مضامین کے مجموعہ ''معیار واقدار'' میں ان کا تنقیدی رویہ سب سے زیادہ نمایاں ہے۔ یہ ضرور ہے کہ ''نقطۂ نظر'' یا ''تشکیل جدید'' کے مضامین میں جو تفصیل ہے وہ ''معیار واقدار'' کے اکثر مضامین میں مفقود ہے، لیکن یہاں نقاد کے تنقیدی نقطۂ نظر کے عملی نمونے زیادہ واضح طور پر سامنے آتے ہیں۔ ''فن اور ناقد''، ''افسانے میں ہیئتی تجربے'' اور ''ہم عصر افسانوں میں اقدار کی اہمیت'' وغیرہ ایسے مضامین ہیں جو نظریاتی بحثوں پر مشتمل ہیں۔ ''آغا حشر اور شیکسپیئر''، ''جدید اردو شاعری میں فیضؔ کا مقام''، ''یوسف حسین خاں: عالم یا ناقد؟'' اور ''اختر اورینوی بحیثیت نقاد'' وغیرہ میں تنقید کی عملی صورت سامنے آتی ہے اور عبدالمغنی کی اخلاقی تنقید نگاری کے وہ تمام پہلو واضح ہو جاتے ہیں جن کا ذکر ہوتا رہا ہے۔ عبدالمغنی کا انداز بیان وضاحتی، مدلل اور محتاط ہے۔ ''جادۂ اعتدال'' کے اسلوب میں ایک ہلکی سی شگفتگی کا احساس ہر جگہ ہوتا ہے جب کہ دوسری کتابوں میں سنجیدگی، گہرائی اور علمیت نسبتاً زیادہ ہے۔

آخر میں عبدالمغنی کی تحریروں میں پائے جانے والے موضوعات کے تنوع کی طرف بھی اشارہ کردینا ضروری سمجھتا ہوں۔ ''تشکیل جدید'' میں انہوں نے اپنے تنقیدی موقف کی وضاحت کرتے ہوئے خود بھی اس کا اعتراف کیا ہے کہ انہوں نے نہ صرف مختلف النوع بلکہ متضاد موضوعات پر قلم اُٹھایا ہے۔ یہ ایک ایسی صفت ہے جو احتیاط کا دامن ہاتھ سے چھوٹتے ہی عیب بن جا سکتی ہے۔

❁❁❁

محمد ولی اللہ قادری
"Qadri Manzil" Lakhbani Bara Chakia, Mashraqi Champaran - 845302

چمپارن کا گمنام شاعر و ادیب: عنایت الرحمٰن عنایتؔ

غیر منقسم چمپارن کی ادبی وملی تاریخ غیر معمولی ہے۔ یہاں کے شعرا وادبا نے اردو زبان وادب کی جو خدمات انجام دیں، وہ تاریخ کا ایک روشن باب ہے۔ یہ اور بات ہے کہ چمپارن کی ادبی وشعری تاریخ سے ہماری نئی نسل دور ہوتی جارہی ہے۔اس کے مجرم خود ہم اہالیان اردو ہیں۔اہالیان اردو کی تساہلی اور ناقدین کی عصبیت کا ہی نتیجہ کہا جائے کہ چمپارن کی سینکڑوں ادبی شخصیات پردۂ خفا میں گم ہوگئیں یا انہیں حیات میں ہی درکنار کردیا گیا۔اہالیان اردو کے رویے کے تناظر میں لاشعوری طور پر حضرت عنایتؔ کے یہ اشعار یاد آجاتے ہیں ؎

بعد مرنے کے تمہیں یاد نہ آجاؤں کہیں
دفن کر دینا مجھے تم میرے اشعار کے ساتھ

روز مرہ کا نمونہ ہے عنایتؔ کا کلام
یہ الگ بات ہے کہ وہ شاعر مشہور نہیں

بیشک عنایت الرحمٰن عنایتؔ کا نام اور ان کا کام چاہے، ہماری شخصیت فراموشی کے رویے کی کتنی ہی نذر ہوئی ہو، مگر اس میں دورائے نہیں ہوسکتی کہ ان کا کلام روزمرہ کا نمونہ ہے اور انہوں نے منصف اور جج کی ذمہ داری نبھاتے ہوئے نصف صدی سے زائد عرصہ تک اردو زبان و ادب کی جو بے لوث خدمات انجام دی ہیں، وہ تاریخ ساز کہلانے کی حقدار ہیں، مگر اسے کیا کہا جائے کہ اس حقیقت کے باوجود چمپارن کے شعرا کے تذکرے اور ''تاریخ گل چمپا'' مولفہ ظفر مجیبی میں عنایت الرحمٰن کی مایہ ناز شخصیت شامل ہونے سے محروم رہی۔ظفر مجیبی کی ایک اور کتاب ''عندلیبان غزل'' حصہ اوّل شائع ہوئی، لیکن معلوم نہیں کیوں اس کتاب میں بھی عنایتؔ مرحوم کو شامل نہیں کیا گیا، حالاں کہ عنایت الرحمٰن عنایتؔ چمپارن کا ایک ایسا ادیب اور شاعر ہے جس پر جتنا فخر کیا جائے کم ہے۔عنایتؔ کی شخصیت غیر معمولی اور متنوع تھی۔ان کے شعری مجموعہ ''بستان رنگا رنگ'' کو ان کے صاحبزادے جسٹس سہیل الرحمٰن نے مرتب کر کے ۱۹۸۵ء میں شائع کیا ہے۔اس پر مصنف کا نام یوں درج ہے:

''مولوی عنایت الرحمٰن چشتی حمیدی اصدقی غفرلہٗ''

عنایت الرحمٰن عنایتؔ کی پیدائش دسمبر ۱۹۱۴ء کو شہر موتیہاری میں ہوئی، آپ کے والد خان بہادر محمد جان مرحوم (متوفی ۱۹ر دسمبر ۱۹۴۹ء) تھے۔ پروفیسر فاروق احمد صدیقی کے بقول:

''خان بہادر محمد جان مرحوم کے والد نومسلم تھے اور ان کا تعلق پہلے صدر جمہوریہ ڈاکٹر راجندر پرشاد کے خاندان سے تھا۔عنایت الرحمٰن عنایتؔ کے دادا ساکن بنیاپور ضلع سارن سے ہجرت کر کے موتیہاری شہر میں آباد ہوئے تھے۔''

اس جانب خود عنایتؔ مرحوم نے اپنے ایک شعر میں اشارہ کیا ہے ؎

چھپرا ہے جس کا نام عنایتؔ بقول میرؔ
ہم رہنے والے ہیں اُسی اجڑے دیار کے

خان بہادر محمد جان موتیہاری کے رئیس اور سب سے بڑے وکیل تھے، وہ گورنمنٹ پلیڈر بھی رہے۔وہ لارڈ آف ترہت کے نام سے بھی جانے جاتے تھے۔محمد جان مرحوم کی پہلی اہلیہ کے بطن سے چار بیٹیاں اور چار بیٹے ہوئے، ان میں سب سے چھوٹی اولاد عنایت الرحمٰن عنایتؔ ہی تھے۔ان کے بڑے بھائی مولوی خلیل الرحمٰن آئی اے پاس کر کے سب رجسٹرار ہوئے، ان کی اولاد میں جناب نسیم محمد جان مرحوم اور پروفیسر فہیم محمد جان بھی شامل ہیں۔دوسرے بھائی مولوی مطیع الرحمٰن نے میٹرک پاس کر کے داروغہ کی ملازمت کی۔تیسرے بھائی عطاالرحمٰن ٹی بی کے مرض سے کم عمری میں ہی انتقال کر گئے۔عنایت الرحمٰن محض دو ڈھائی سال کے ہی تھے کہ والدہ کا انتقال ہوگیا، خان بہادر محمد جان مرحوم نے

دوسرا نکاح کیا، جس سے جمیل الرحمٰن جمیلؔ اور پروفیسر شکیل الرحمٰن وغیرہ پیدا ہوئے۔ مولوی عنایت الرحمٰن کی پرورش سوتیلی ماں کے زیر سایہ ہوئی اور اس طرح انہوں نے بہت ہی کرب کا دور دیکھا جس کا اظہار ان کے اس شعر میں ہوا ہے ؎

عہد طفلی سے قفس مل گیا صیاد ہمیں
کس چمن میں تھا نشیمن نہیں کچھ یاد ہمیں

خاندانی روایت کے مطابق ابتدائی تعلیم کے بعد ۱۹۲۹ء میں موتیہاری سے ہی عنایتؔ نے میٹرک کا امتحان فرسٹ ڈویژن سے پاس کیا اور ڈسٹرکٹ اسکالرشپ حاصل کی۔ جی بی بی (گریر بھومیار اور برہمن) کالج مظفر پور موجودہ ایل ایس (لنگٹ سنگھ) کالج مظفر پور سے ۱۹۳۱ء میں آئی اے کیا اور ۱۹۳۳ء میں اسی کالج سے بی اے بھی کیا، پھر دو سال کے بعد ان کا داخلہ پٹنہ لا کالج میں ہوا، جہاں سے ۱۹۳۷ء میں بی ایل کیا اور یونیورسٹی میں اوّل پوزیشن حاصل کی۔ دو تین برسوں تک عنایت الرحمٰن نے وکالت کی۔ بعدہٗ ۱۹۴۰ء میں جج اور منصف کے انٹرویو میں انہیں کامیابی ملی، پہلی پوسٹنگ بحیثیت منصف اور سب جج رانچی میں ہوئی۔ دو برس کے بعد سیوان تبادلہ ہوا۔ ۱۹۴۴ء میں چھپرا، ۱۹۴۵ء میں ڈالٹین گنج، ۱۹۴۶ء میں مدھوبنی میں رہے۔ ۱۹۴۹ء میں دوسری دفعہ سب جج کے عہدہ پر ہی چھپرا تشریف لائے اور ۱۹۵۱ء تک چھپرا ہی میں رہے۔

۱۹۵۲ء میں پٹنہ تشریف لے گئے، بہار اسمبلی سکریٹری کی حیثیت سے خدمات انجام دیں، اس کے بعد ایڈیشنل ڈسٹرکٹ جج ہو کر مونگیر تشریف لے گئے، جنوری ۱۹۶۸ء میں ان کا پرموشن اور تبادلہ بحیثیت ڈسٹرکٹ جج پورنیہ ہوا۔ ۱۹۷۰ء میں عنایت الرحمٰن عنایتؔ کی تقرری بہار قانون ساز اسمبلی پٹنہ میں بحیثیت سکریٹری ہوئی جہاں سے جنوری ۱۹۷۱ء میں سبکدوش ہوئے۔ ۱۹۷۲ء میں اپنی اہلیہ ذکیہ رحمٰن اور بیٹے سہیل الرحمٰن کے ہمراہ حج بیت اللہ اور زیارت حرمین شریفین سے مشرف ہوئے۔ پہلی اپریل ۱۹۷۸ء کو ان کی اہلیہ کا انتقال ولی گنج آرا میں ہوا اور خاندانی قبرستان میں سپرد خاک ہوئیں۔ اہلیہ کے وصال کے بارہ سال بعد ۹ جون ۱۹۹۰ء کو آرا میں عنایتؔ کا انتقال ہوا اور جنازے کی نماز حضرت مولانا شاہ یعقوب علی نے پڑھائی اور اہلیہ کے بغل میں مدفون ہوئے۔ حضرت مولانا شاہ فرید الحق عمادی، سجادہ نشین خانقاہ عمادیہ، پٹنہ سٹی نے چہلم کی مجلس سے خطاب کیا۔

۱۹۷۶ء میں عنایت الرحمٰن کی نعتوں کا مختصر مجموعہ ''بستان نعت'' کے نام سے جسٹس انوار احمد نے شائع کیا جب کہ ۱۹۸۵ء میں عنایتؔ کا شعری مجموعہ ''بستان رنگا رنگ'' کے عنوان سے شائع ہوا جس پر اظہار خیال اگلے صفحات پر کیا جائے گا، عنایت الرحمٰن نے عنایتؔ طالب علمی کے ابتدائی دور میں ہی شاعری کا آغاز کر دیا اور مقامی سطح کے مشاعروں میں شریک ہونے لگے، جیسا کہ ''بستان رنگا رنگ'' کے مرتب اور مقدمہ نگار سہیل الرحمٰن رقم طراز ہیں:

''آپ (عنایت الرحمٰن عنایتؔ) جب آٹھویں کلاس میں پہنچے تو آپ نے باقاعدہ شاعری شروع کر دی اور مشاعروں میں شرکت کرنے لگے، اس وقت موتیہاری میں اور استاد فن حضرت عسرتؔ حسین صاحب تھے، مقامی شاعروں میں کوئی اچھا شاعر نہ تھا، شاہ مجیب شاہ کمپاؤنڈر اور ڈاکٹر عبدالرشید صاحب داناپوری مشاعروں کی جان ہوا کرتے تھے۔ دونوں حضرات شاہ قائم صاحب قتیلؔ داناپوری سے اصلاح لیا کرتے تھے، یہ وہ زمانہ تھا جب قتیلؔ صاحب کی شاعری شباب پر تھی۔ موتیہاری کے مشاعروں میں قائم صاحب کی غزلیں غائبانہ طور پر پڑھی جاتی تھی، ابا جان کی پہلی غزل کے صرف چند ہی شعر مل سکے، ملاحظہ فرمایئے ؎

کئے تم نے ہزاروں مجھ سے وعدے
ہوا کوئی مگر وعدہ وفا بھی
چلا آیا تھا یوں ہی میں عنایتؔ
سنا تھا ہوتی ہے یہاں پر سبھا بھی

(بستان رنگا رنگ، ص ۲۱)

میٹرک کے بعد عنایتؔ کی شاعری پروان چڑھی۔ ۱۹۳۱ء کو جی بی بی کالج مظفر پور میں غزل گوئی کا ایک انٹر یونیورسٹی مقابلہ ہوا۔ مصرع طرح تھا:

''موت ہے تیرے تصور سے جدا ہو جانا''

اس مقابلے کے جج کے طور پر پروفیسر عبدالماجد، مولانا تمنا عمادیؔ، پھلواروی اور حضرت داغؔ دہلوی کے شاگرد رشید حضرت نوح نارویؔ تھے۔اس مصرع پر حضرت عنایتؔ نے شعر پڑھا ؎

تجھ سے ہو جانا جدا موت نہیں ہے لیکن
موت ہے تیرے تصور سے جدا ہو جانا

شعر سنتے ہی تمام حضرات نے خوب داد دی اور حضرت نوح نارویؔ نے تو خوشی میں عنایت الرحمٰن کو گلے لگا لیا اور اپنی شاگردی میں قبول کر لیا، اس لئے عنایتؔ کی شاعری پر نوح نارویؔ کے اثرات مرتب ہوئے، خود عنایتؔ فرماتے ہیں ؎

رنگ یاروں کا عنایتؔ میں جمتا نہیں
کیوں کہ اپنا نوح والا سیدھا سادہ رنگ ہے

حضرت مولوی عنایت الرحمٰن کی شخصیت کا یہ پہلو بھی ہمیں متوجہ کرتا ہے کہ انہوں نے اعلیٰ عہدہ پر فائز رہتے ہوئے بھی بالکل سادہ اور فقیرانہ زندگی گزاری، مذہبیات سے خاص شغف رہا، رانچی کے قیام کے دوران مذہبی اثرات ذرا کم کم مرتب رہے، لیکن چھپرا تشریف لاتے ہی ان کی زندگی بدل گئی یہاں تک کہ چھپرا کے ایک بزرگ شاہ عبدالحمید چشتی اصدقی سے مرید بھی ہوئے۔

شاہ عبدالحمید چشتی، حضرت شاہ فیاض الدین کے مرید و خلیفہ تھے، جنہیں حضرت خواجہ پیام الدین اصدق کے صاحب زادے اور خلیفہ حضرت شاہ شہود الحق چشتی سے سلسلہ چشتیہ نظامیہ فخریہ اصدقیہ کی خلافت و اجازت حاصل تھی۔ بیسویں پشت میں ان کا سلسلہ عطائے رسول خواجہ غریب نواز معین الدین چشتی اجمیری قدس سرہ تک پہنچتا ہے۔ حضرت مولوی عنایت الرحمٰن چشتی کے سلسلے میں یہ جان کر حیرت ہوگی کہ انہیں خلافت بھی حاصل تھی اور خواہش مند حضرات کو سلسلہ چشتیہ سے وابستہ بھی کرتے تھے۔ عہد حاضر کے مشہور ناقد اور استادالاساتذہ حضرت پروفیسر نجم الہدیٰ حضرت عنایتؔ ہی سے مرید تھے، یہ دیگر بات ہے کہ عنایت الرحمٰن، پروفیسر نجم الہدیٰ مرحوم کے سگے ماموں بھی تھے۔ پروفیسر نجم الہدیٰ مرحوم نے اپنی مشہور کتاب ''تصوف اور کلام قربیؔ'' مطبوعہ ۱۹۸۴ء کا انتساب یوں کیا ہے:

''میں اپنی اس ناچیز تصنیف (تصوف اور کلام قربی) کو حضرت قبلہ پیر و مرشد سیدی و آقائی الحاج شاہ مولوی عنایت الرحمٰن صاحب چشتی القادری زاداللہ مجدہٗ و دام فیضہ کے نام نامی گرامی سے معنون کرنے کی سعادت و شرف حاصل کرتا ہوں۔''

حضرت عنایت الرحمٰن عنایتؔ نے جہاں اردو کی خدمات انجام دیں، وہیں انہوں نے ہندی کو بھی اپنے فیض سے محروم نہیں کیا، بلکہ ہندی زبان کے لئے بیش بہا خدمات انجام دیں، جسٹس سہیل الرحمٰن لکھتے ہیں کہ:

''ابا جان جس زمانہ میں اسمبلی کے سکریٹری تھے، وہ زمانہ ہندی کا ابتدائی دور تھا، سرکاری دفتروں میں ہندی فوراً ہی لاگو کی گئی تھی، ہندی کے سرکاری استعمال کے لیے ڈکشنری نہیں تھی اور نہ ہی بہت سے محکمہ جاتی لفظوں کے لئے ہندی کے موزوں الفاظ تھے، اسمبلی کے سکریٹری ہونے کے ناطے ابا جان کو اس سلسلے میں بہت کچھ کرنا پڑا تھا۔ اس طور پر سرکاری سطح پر ہندی کی ترقی میں ان کا بڑا ہاتھ رہا، لیکن جب تک وہ نوکری میں رہے، ان کی خدمت کا اعتراف سرکاری سطح پر نہیں کیا گیا۔ یوں شری بابو چیف منسٹر بہار نے ۱۹۵۷ء میں سکریٹریٹ میں ہوئے ہندی پاس کئے گئے افسروں کے جلسہ تقسیم اسناد میں ابا جان کی ہندی دانی کی بڑی تعریف کی تھی، لیکن نوکری سے سبکدوشی ہونے کے بارہ برس بعد ۱۹۸۳ء میں حکومت بہار نے ان کو ریاستی سطح پر اعزاز بخشا اور اس سلسلے میں بھارتی نریتہ کلا مندر میں ایک خاص تقریب میں حکومت بہار (کی جانب سے) ابا جان کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے ان کو ریاستی سطح پر سمان پتر اور ۵۰۱ روپے گورنر بہار عالی جناب اخلاق الرحمٰن قدوائی کے ہاتھوں دیا گیا۔'' (بستان رنگا رنگ ص ۶۱)

عنایت الرحمٰن عنایتؔ کی شعری کائنات کے مطالعہ سے حیرت ہوتی ہے کہ انہوں نے متعدد اصناف سخن مثلاً حمد، نعت، منقبت، نظم، قصیدہ، شخصی

مرثیہ، سلام ، نوحہ اور غزل پر طبع آزمائی کی ہے، یہ دیگر بات ہے کہ نعت اور غزل کے نمونے بیش از بیش موجود ہیں۔ اشاعت کے اعتبار سے سب سے پہلے ان کی نعت کا مختصر مجموعہ ''بستان نعت''، جسٹس انوار احمد نے مرتب کر کے ۱۹۷۶ء میں شائع کیا تھا، اس لئے ان کی نعت گوئی پر اظہار خیال اولیت کا درجہ رکھتا ہے۔ متذکرہ کتابچہ کی تقریظ میں جسٹس انوار احمد لکھتے ہیں کہ:

''بستان نعت' جناب عنایت الرحمٰن عنایتؔ ریٹائرڈ ضلع جج صوبہ بہار کے فکر کا نتیجہ نہیں بلکہ فیضان کا شاخسانہ ہے۔ جناب موصوف موتیہاری صوبہ بہار کے ایک ممتاز خاندان کے فرد ہیں اور سلسلہ چشتیہ فخریہ اصدقیہ سے وابستہ ،نعت گوئی صنف شاعری کا بہت اہم رکن ہے...... میں ان کے بعض اشعار کو الہامی سمجھتا ہوں۔''

(بستان رنگا رنگ، ص ۱۳)

جب ہم عنایتؔ کی نعتوں کا مطالعہ کرتے ہیں تو جسٹس انوار احمد کی رائے سے اتفاق کرنا ہی پڑتا ہے، ''بستان نعت'' کی کئی نعتیں غالباً ''بستان رنگا رنگ'' میں بھی شامل ہیں۔ جن کی مجموعی تعداد ۳۵ ہے، سبھی نعتیں ۱۹۳۴ سے ۱۹۸۲ کے درمیان کہی گئی ہیں۔ ''بستان رنگا رنگ'' میں شامل سبھی نعتیں ایسی ہیں جس کے مطالعہ کے بعد ان کی حلاوت کی تاثیر دیر تک قائم رہتی ہے۔ ۱۹۶۰ء کے بعد تو عنایت الرحمٰن عنایتؔ نے دیگر اصناف کو چھوڑ کر صرف نعت ہی سے لگاؤ رکھا اور علمی و ادبی مطالعہ خاص طور پر تصوف کی کتابوں سے اپنا تعلق بنائے رہے اور محفل میلا دالنبی صلی اللہ علیہ وسلم میں خطاب بھی کرنے لگے۔

عنایتؔ کے نعتیہ سرمائے میں عقیدہ اہل سنت کی بھرپور ترجمانی دکھائی دیتی ہے۔ عنایتؔ مرحوم کی نعتیہ شاعری کے مطالعہ سے موتیہاری کے مذہبی ماحول کی عکاسی بھی ہوجاتی ہے۔ یوں تو پروفیسر شکیل الرحمٰن سابق مرکزی وزیر صحت اور مشہور مصنف نے اپنی خودنوشت سوانح حیات آشرم میں بھی موتیہاری کی خوش عقیدگی والے ماحول کا ذکر کیا ہے۔ بہر حال عنایت الرحمٰن عنایتؔ نے ۱۹۳۴ء میں محض ۲۰ سال کی عمر میں جو نعت کہی، اسے ملاحظہ فرمائیں۔

لکھتا ہوں نعت خاص رسول کریم کی
اب لوح چاہیے مجھے عرش عظیم کی
تشبیہ آپ کے دہن و زلف و قد کی ہے
مجھ پر گرہ کھلی یہ الف لام میم کی
آتی ہے باغ کوچہ احمد سے آج کیا
خوشبو کے دوش پر ہے سواری نسیم کی
نکلی جو آہ سینہ سوزاں سے ہجر میں
قندیل بن گئی وہی عرش عظیم کی
کس دوزخی نے نام محمد کا لے لیا
آتش حیا سے ہوگئی ٹھنڈی جحیم کی
حلقہ ہے میرے کان میں احمد کے دال کا
دل پر گرہ پڑی ہے محمد کی میم کی
وہ بحر بے کنار ، عنایتؔ ہے بحر عشق
کشتی تباہ ہوگئی فہم فہیم کی

عنایت الرحمٰن عنایتؔ کی پیش نظر اس نعت کی تشریح و توضیح کی جائے تو ایک مضمون تیار ہوسکتا ہے۔ یہ نعت شاعر کے اولین دور کا نمونہ ہے اس لئے اس میں جو شعریت ہے اور شاعر نے جس فنی چابک دستی کا مظاہرہ کیا ہے، وہ آج بھی حیرت میں ڈال رہی ہے۔ اس نعت کے مطالعہ سے اس دور کی یاد تازہ ہوجاتی ہے۔ ۱۹۳۴ء کا زمانہ مشہور بہار میں زلزلہ کی وجہ سے یاد کیا جاتا ہے، اس زلزلے میں شاعر نے اپنے والد کے مکان کو منہدم ہوتے ہوئے دیکھا بھی تھا، لیکن شاعر نے اس دور کا مرثیہ نہیں لکھ کر پیارے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کی نعت پیش کر کے یہ نظریہ دیا کہ ہر مصیبت کا مداوا ذکر مصطفیٰ ہی ہے۔

عنایتؔ کی نعت گوئی کی یہ خصوصیت ہمیں متوجہ کرتی ہے کہ انہوں نے اپنی نعت میں عقیدہ نور مصطفیٰ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا جسم بے سایہ ہونے، جیسے عقیدے کو جہاں پیش کیا ہے وہیں شفاعت کبریٰ اور اختیارات مصطفیٰ جیسے موضوعات کو بھی اپنی نعت میں پیش کر کے مسلمانوں کو ایک اہم پیغام دیا ہے۔ شاعر کا ماننا ہے کہ دنیا کا نظام جناب رسول اللہ صلی علیہ وسلم کے صدقے میں ہی چل رہا ہے۔

قد جاکم نور وقرآنِ نورِ مبینا
یعنی کہ فقط نور ہی ہے نور کا پیغام

رخسار و زلف صاحب لولاک کے طفیل
سارا تماشا ہوتا ہے لیل و نہار کا

منکر نکیر آئیں گے ہم تو یہی بتائیں گے
ہم ہیں غلام مصطفیٰ صل علی محمد

ذات تھی ان کی حق کا سایہ اس لئے سایہ ساتھ نہ آیا
نورِ سراپا نورِ مجسم صلی اللہ علیہ وسلم
خوف حساب روز قیامت، کچھ بھی نہیں ہے مجھ کو عنایتؔ
ورد زباں ہے میرے ہردم صلی اللہ علیہ وسلم

تمہارا عکس جمال یہ ہے جو چاند سورج کا حال ہے یہ
نہ یہ منور نہ وہ منور صلاۃ تم پر سلام تم پر

عنایتؔ مرحوم نے غلام ملک سے آزاد ملک تک کا مشاہدہ کیا اور دونوں حکومتوں اور سرکاروں میں ملی اور سماجی خدمات انجام دیں، لیکن شاعر آخر میں جس نتیجے پر پہنچا ہے اسے شاعر ہی کے الفاظ میں دیکھیں ۔

نبیوں کے رسولوں کے وہ سالار رہیں گے
سردار تھے، سردار ہیں، سردار رہیں گے
مجبور کبھی تھے، نہ رہیں گے، نہ وہ اب ہیں
مختار تھے، مختار ہیں، مختار رہیں گے
تا حشر دو عالم میں ہے ان کی حکومت
سرکار تھے، سرکار ہیں، سرکار رہیں گے

عنایت الرحمٰن عنایتؔ کی کتاب ''بستان رنگارنگ'' میں فارسی زبان میں لکھی گئی ایک نعت بھی موجود ہے، اس نعت میں جو نغمگی ہے، وہ قابل دید ہے، اس نعت کے چند اشعار بھی ملاحظہ کریں ۔

دل برای تو یا رسول اللہ
جاں فدای تو یا رسول اللہ
چه مدح کنم تو که مدح کند
خود خدای تو یا رسول اللہ
سرمۂ چشم عارفان باشد
خاک پای تو یا رسول اللہ
توشه آخرت ندارم هیچ
جز ولای تو یا رسول اللہ
نظر لطف بر عنایتؔ کن
این گدای تو یا رسول اللہ

بلاشبہ پیش کردہ ان نعتیہ اشعار میں جو نغمگی اور ماحول سازی ہے وہ اپنی جگہ، لیکن چھوٹی بحروں میں پیش کئے گئے اشعار کی نغمگی کچھ زیادہ ہی متاثر کرتی ہے، بہرکیف ازراہِ اختصار یہاں اب ان کے صرف اِن اشعار پر اس موضوع سے رخصت چاہتا ہوں ۔

اے کاش کہ اس راز کو واعظ بھی سمجھ لے
اسلام محمد ہے، محمد ہی ہیں اسلام
کیا پوچھتے ہو نام و نشاں پوچھنے والو
مداح پیمبر ہوں عنایتؔ ہے مرا نام

عنایت الرحمٰن عنایتؔ نے اگرچہ آخری دور میں تقدیسی خصوصاً نعتیہ شاعری کو اپنا وظیفہ سخن بنالیا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کی شعری کائنات میں غزل کی جلوہ گری بھی کچھ کم نہیں، ان کے مجموعہ کلام ''بستانِ رنگارنگ'' میں اچھی تعداد میں ان کی غزلیں شامل ہیں۔ عنایتؔ کی غزلوں میں موضوعات کی وسعت اور رنگا رنگی بے پناہ ہے، عشق حقیقی و عشق مجازی کا نہایت حسیں سنگم جابجا نظر آتا ہے ۔

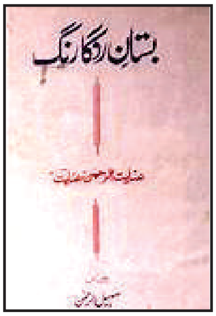

خراب عشق کو الفت میں کیا دینا کیا لینا
دعا دینا دغا پانا، وفا کرنا جفا لینا
بہت آسان ہے رکھنا نمک دل کی جراحت پر
بہت دشوار ہے مزا پانا مزا لینا

شاعر نے اپنی محبوبہ کی سراپا نگاری اور اس کے حسن کو بھی برتنے کی کوشش کی ہے۔ عنایتؔ کے کلام میں حسن تکرار کے صدہا جلوے ہیں اور ان کی بہت سی غزلیں رومان کی طرف بھی اشارہ دیتی ہیں ۔

رُخ کتابی ، شوخ آنکھیں اور بھبھوکا رنگ
حسن والے وہ نرالے ہیں نرالا رنگ

اے عنایتؔ غزل میں شوخی ہو
طبع موزوں بھی ہے ، شباب بھی ہے

لوگ کہتے ہیں عنایتؔ ہے نہایت پارسا
ڈال دو گردن میں باہیں آزمانے کے لئے

عنایتؔ کی غزلوں میں جام و مینا کا ذکر بھی ملتا ہے، اسی طرح طنز ملیح کا نہایت لطیف نمونہ بھی دکھائی دیتا ہے ۔

آنکھوں سے پی رہے ہیں عنایتؔ بقا کا جام
امرت بھرا ہوا جو کسی کی نظر میں ہے

حسن والوں سے آپ کو نفرت
مئے سے حضرت کو اجتناب بھی ہے

عنایت الرحمٰن عنایتؔ نے جہاں اپنی نعت گوئی میں عجز و انکساری کا مظاہرہ کیا ہے، وہیں غزل کے سلسلے میں معاملہ اس کے برعکس ہے، یہاں خودداری کی عمدہ مثال مل جاتی ہے ۔

سر جھک نہ سکا اپنا کبھی غیر کے آگے
ہم پر غم جاناں کے یہ احسان بہت ہیں

عنایت الرحمٰن عنایتؔ کی غزلوں میں عصری احساسات اور قلبی کیفیات کا نمونہ بھی ہمیں خاص طور سے متاثر کرتا ہے اور سوالیہ طرز میں بھی بڑی گہرائی اور معنویت ملتی ہے ۔

چمن کی کیاری کیاری ہم نے اپنے خون سے سینچی
ہماری ہی مخالف پھر ہوائے گلستاں کیوں ہو

اتنا ہی نہیں بلکہ عنایتؔ کی غزلوں میں صوفیانہ لے بھی ناقدین کو اپنی طرف دعوت فکر دے رہی ہے۔ اس قبیل کا محض ایک شعر ملاحظہ فرمائیں ۔

مرنے کے وقت تھی تری تصویر سامنے
مرنے کے بعد بھی مری آنکھوں میں نور تھا

عنایت الرحمٰن عنایتؔ چمپارن کے اُن فنکاروں میں محسوب ہوتے ہیں جنہیں صرف شعر و شاعری سے ہی شغف نہیں تھا، بلکہ وہ نثر نگاری سے بھی خصوصی دلچسپی رکھتے تھے۔ ان کی نثری تخلیقات معیاری اردو رسائل و جرائد میں اشاعت یافتہ ہیں۔ عنایتؔ کی نثری تحریر میں ان کے مضامین اور جاسوسی ناول شامل ہیں، یہ دیگر بات ہے کہ ان کی نثری باقیات عصبیت کا شکار ہوگئیں اور ان کی زمانے نے قدر نہ کی۔ اس سلسلے میں عنایتؔ کے صاحبزادے سہیل الرحمٰن لکھتے ہیں :

''۱۹۴۲ء سے ۱۹۴۴ء تک شاعری کم کی، اس دور میں انہوں نے بیشتر طنز نگاری کی اور ملازمت کی مجبوری سے اپنے نام سے نہیں بلکہ اللہ پوری کے فرضی نام سے ماہنامہ 'ندیم' گیا میں چھپواتے رہے۔ 'حکیم جی'، 'قاضی جی'، 'سب ڈپٹی' اور 'استھان ناستان' ان کے مضامین کافی پسند کئے گئے، بدقسمتی سے اس کا کوئی پرچہ محفوظ نہیں رہ سکا اور میں نے تو شاید ان کو پڑھا بھی نہیں، اسی دور میں انہوں نے ایک جاسوسی ناول 'سونے کا بت' اماق جان کے نام سے لکھا جو قسط وار 'ندیم' گیا میں ۱۹۴۰ء سے ۱۹۴۷ء تک شائع ہوا۔ اس کا بھی کوئی پرچہ ہمارے پاس موجود نہیں ہے۔ ۱۹۵۶ء اور ۱۹۵۷ء میں 'ندیم' کے پرانے شمارے سے لے کر 'فروغ اردو' لکھنو نے اسے پھر قسط وار شائع کرنا شروع کیا تھا، پتہ نہیں انہوں نے پورا شائع کیا یا نہیں، جب ہم لوگوں نے ان سے خط و کتابت کی اور ان سے پورا مسودہ مانگا تو انہوں نے لکھا کہ پوری کتاب شائع کر کے دیں گے، لیکن بعد کو وہ ادارہ ہی بند ہو گیا اور اس کے اراکین کہاں گئے کچھ پتہ نہیں۔'' (بستان رنگارنگ، ص۳۴)

منثورات عنایتؔ کے بارے میں مذکورہ باتیں ہزار دلخراش سہی، مگر اس میں دورائے نہیں ہوسکتی کہ عنایتؔ کی اردو خدمات نا قابل فراموش ہیں۔ بیشک اردو کے حوالے سے ان کی شخصیت قابل رشک تھی۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ناقدین شعر و ادب عنایتؔ کی شاعری اور نثر نگاری کے فیض کو عام کریں تا کہ ہماری نئی نسل حضرت عنایتؔ کی شخصیت اور شاعری سے حظ وافر پا سکے۔ ❁❁❁

محمد علی عالم
Lal Parsa, P.o. Bahri Bankatwa, Sakta, West Champaran- 845101 (Mob. 8521437849)

صنف انشائیہ: اہمیت وافادیت

نثری ادب کی دنیامیں طرزتحریر کی وجہ سے انشائیے کو اہم مقام اوراس صنف کومضمون سے زیادہ اہمیت کا درجہ حاصل ہے، کیونکہ انشائیہ نگارصرف لفظوں کی بندش اور جملوں کے بنگلےنہیں کھڑا کرتا، بلکہ وہ اپنے نمائندہ اسلوب کی وجہ سے زبان وبیان کی صلاحیتوں کوواضح کرتا ہےاوراس کے ساتھ ہی اظہار کی چابک دستی کوبھی نمائندگی دیتا ہے۔

یوں توسبھی صنف ادب کی اہمیت وافادیت اپنی اپنی جگہ مسلم ہےاوران میں لکھنے والا بآسانی موضوع کا حق ادا کرسکتا ہے،لیکن انشائیہ نگاری کے لئے کچھ حقائق اور کچھ اہم اصولوں کی طرف توجہ دینا ضروری ہے۔انشائیہ نگارنہ صرف دیدۂ بینا رکھتا ہے، بلکہ اس کے ہاتھ میں ایسی تاثیر ہوتی ہے کہ وہ نوک قلم سے ہر ناممکن موضوع کوممکن اسلوب سے آراستہ کرنے کا کام انجام دیتا ہے، جب کہ مضمون نگاری میں عنوان کاتعین کرنے کے بعد دوتین کتابیں زیرمطالعہ رہیں تومضمون کی تیاری کاحق کسی نہ کسی حدتک ادا ہوسکتا ہے،مگرانشائیہ کی دنیااتنی سہل نہیں۔سب سے اہم مسئلہ انشائیے کواہمیت اورمقبولیت دلانے میں اس کی طرز نگارش یاپھراسلوب کی صلاحیت کا ہوتا ہے،جس کے ذریعہ ہی کسی انشائیے کی شناخت مضمون سے الگ قرار دی جاتی ہے۔اگر یہ کہا جائے توبیجا نہ ہوگا کہ مضمون اصل میں موضوع سے متعلق مواد اوراس کے ساتھ زبان، اظہار کا وسیلہ ہے جس کے ذریعہ کسی نہ کسی عنوان کی نمائندگی ہوتی ہے، جب کہ انشائیہ عنوان کا پاس ولحاظ نہیں دیکھتا، بلکہ انشائیے کی صنف میں انشاپردازانہ سلوک کا شامل رہنا ہی سب سے بڑا رویہ ہے، اس لئے انشائیے کواس کے اسلوب اورطرز نگارش کی بنا پر غیرافسانوی نثرکی صنف کےطور پرقبول کیا جاتا ہے۔

انشائیہ ایک صنف اظہار ہی نہیں، بلکہ انسان کی فطرت کے عین مطابق نمائندگی کرنے والا ایک ایسا طرز اظہار ہے، جس میں انسان کی زندگی اوراس کے طرزعمل ہی نہیں، بلکہ زندگی کے ہرمعاملہ کی نمائندگی ممکن ہے،اس لئے انشائیے کی صنف کی اہمیت وافادیت دوسری اصناف کے مقابلہ میں کئی گنازیادہ ہوجاتی ہے۔چونکہ انشائیہ نگاری میں سنجیدہ افکار کا اظہار ہی نہیں ہوتا بلکہ اس کے ساتھ ہی طنزومزاح کے تیر بھی برسائے جاتے ہیں،اس لئے انشائیہ کی صنف اردو کی دوسری نثری اصناف میں زیادہ کارآمد ہے۔

تکنیکی اعتبار سےانشائیہ حددرجہ چست اور ہلکے پھلکےمضامین سے زیادہ کارآمد صنف کا درجہ رکھتا ہے۔اس صنف کی خصوصیت یہی ہے کہ انشائیہ نگاراپنی تحریر کے ذریعہ نہ صرف اپنے ظرف کی نمائندگی کرتا ہے، بلکہ اس کے توسط سے قوم اور سماج ہی نہیں، بلکہ انسان کوبھی انسانیت کے حدود میں پابند کرنے کا کارنامہ انجام دیتا ہے، اسی لئے انشائیہ نگاری ایک باظرف صنف اور ادبی تحریروں میں ہمہ گیری پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ لوگوں کی زندگیوں کوحیات بخش معاملات اور افکار سےوابستہ کرنے والی صنف مانی جاتی ہے،جس میں اظہار کی خوبی اورتخیئل کی فراوانی کے ساتھ ساتھ تجربات اوراحساسات کی دنیا کے ذریعہ انسان کوجانور کے مزاج سے ہٹانے اوراس کوانسانیت کے حدود میں داخل کرنے کاشعور پایا جاتا ہے۔

انشائیے کواردو کی غیرافسانوی اصناف میں سب سے تازہ کار اور کارآمد صنف کا درجہ دیا جاتا ہے تو اس میں حیرت کی بات نہیں۔انشائیہ نگاری کا اپناانفرادی وصف ہے،جس کے ذریعہ نہ صرف مقصد کا حصول لازمی ہوتا ہے، بلکہ انسانی جبلت اوراس کی زندگی کے تقاضوں کی تکمیل بھی انشائیہ نگاری کے ذریعہ ممکن ہے۔انشائیہ ذہنوں میں انقلاب پیدا کرنے والی خصوصیت سے وابستہ ایسی نثری صنف ہے،جس میں جدت اورحقیقت کےعلاوہ تجربات اوراحساسات کی دنیا شامل ہوتی ہے۔

اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ عام طور پر طبیعت کی جولانی دکھانے اور اپنی فطری صلاحیت اور ذوق کی نمائندگی کرنے کے دوران انشائیہ نگاری کا فروغ ممکن نہیں، بلکہ وہی لوگ انشائیے کی خصوصیت کو اظہار کا ذریعہ بناسکتے ہیں، جو سنجیدہ طبعی کے ساتھ ساتھ تبدیلی وتغیر اور زندگی کے اونچ نیچ سے پوری طرح واقفیت رکھتے ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ اردو میں مضمون لکھنے والے اور دوسری نثری اصناف کی نمائندگی کرنے والے افراد کی تعداد تو بہت مل جائے گی، لیکن انشائیے کی خصوصیت کو تحریر کا وسیلہ بنانا، صرف ایسے ہی شخص کا وطیرہ ہوگا، جو درحقیقت قوم وملت اور انسانوں کی فلاح و بہبود کا جذبہ رکھنے کے ساتھ ساتھ خود اپنے آپ کو تہذیب واخلاق سے وابستہ رکھتا ہو۔

یہ حقیقت ہے کہ انشائیے کا اسلوب کسی اور صنف میں شامل ہونا ممکن نہیں، صرف انشائیہ ہی نہیں، بلکہ دوسری اصناف کے اسلوب میں بھی فرق پایا جاتا ہے۔ میر عابد علی عابد نے اپنی کتاب میں یہ بات واضح کی ہے کہ ہر اسلوب کی صفات میں فکری عنصر کا غالب ہونا فطری ہے، مگر ہر فکری اسلوب، ہر صنف کا اظہار نہیں ہوسکتا۔ فکری اسلوب میں سادگی کو بہرحال اولین درجہ حاصل ہے۔ اس خصوص میں انشائیہ نگار بھی اپنی سادہ فکری صلاحیت کے ذریعہ انشائیے کی اہمیت وافادیت میں اضافہ کرنے کا وسیلہ بن جاتا ہے۔ سید عابد علی عابد اپنی کتاب میں رقم طراز ہیں:

> ''زبان کا مقصد اصلی و بنیادی ابلاغ ہے کہ آپ اپنے خیالات، افکار اور جذبات کو دوسروں تک منتقل کرسکیں۔ اگر اس میں کامیابی نہ ہوئی تو ادب کا منصب ہی فوت ہوجائے گا۔''

اس سے واضح ہوتا ہے کہ انشائیہ کا مقصد اور اس کی اہمیت کا تمام تر دارومدار اس شعوری رویہ پر ہے کہ اس کے ذریعہ کوئی بھی بات دوسروں تک پہنچانے کے لئے آسان اور واضح طریقہ اپنایا جائے، ورنہ غیر واضح، پیچیدہ اور ثقیل الفاظ سے مزین تحریر کا طریقہ اختیار کیا جائے گا تو لازمی طور پر انشائیے کی اہمیت وافادیت میں کمی واقع ہوگی، اس لئے ہر انشائیہ نگار اپنے تجربات اور احساسات کو پیش کرنے کے دوران ترسیل اور ابلاغ کو اہمیت دیتا ہے، تاکہ اس کی پیشکش میں حقیقت پسندی اور تاثیر کی صلاحیت پیدا ہوجائے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ ناول، افسانہ اور دوسری نثری اصناف میں بھی تاثیر کی قوت ہوتی ہے، لیکن اس قسم کی تاثیر میں انسان کو خیالی دنیا اور قیاسی باتوں پر یقین کرنا پڑتا ہے، جب کہ انشائیہ نگاری کے ذریعہ کسی بھی خیالی اور قیاسی دنیا میں حقیقی دنیا کی نمائندگی اور اس میں رہنے بسنے کے علاوہ عام انسانوں سے آپسی تعلقات اور ربط وتسلسل کو پیش کرنے کا وصف ملتا ہے جو درحقیقت انشائیہ نگاری کا خصوصی وصف ہے۔

اس صنف نثر میں نہ صرف خیالات، احساسات اور حق پسندی کے علاوہ فطری نمائندگی کی گنجائش کے ساتھ ساتھ جملوں، فقروں اور بندشوں کا ایسا اظہار ہوتا ہے جس سے پیش ہونے والے افکار کی نہ صرف خود بہ خود وضاحت ہوتی ہے، بلکہ انشائیہ نگار کے ذہنی رویوں کو تسلسل کے ساتھ نمائندگی کا حق بھی مل جاتا ہے، اس لئے انشائیہ کسی وقت بھی بے بنیاد افکار سے بوجھل اور غیر فطری طرز سے وابستہ نہیں ہوتا۔ انشائیہ درحقیقت مضمون کی بلند خیالی کی ایسی تفسیر ہے جس میں عالمی اخلاق اور اعلیٰ معاشرتی اور معاشی افکار کو پیش کرتے ہوئے انشائیہ نگار اپنے افکار کو نہ صرف سماج اور معاشرہ کا آئینہ دار بناتا ہے، بلکہ حق پرستی کی دنیا میں تغیر کا جذبہ لے کر تحریر کو ایسے رنگ میں لے آتا ہے کہ انشائیہ کا مطالعہ کرنے والا متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ❀❀

فن وادب کے معقول فروغ کی خاطر......

میرے سامنے یہ حقیقت ہمیشہ رہی ہے کہ اخلاقی رابطوں اور ضابطوں کو نظرانداز کرکے فن وادب کی نہ تخلیقی روایات کا معقول فروغ ممکن ہے اور نہ تنقیدی روایات کا۔ نقطہ نظر خواہ کوئی بھی اختیار کیا جائے، فن و ادب کو عصری اور سماجی حوالوں سے ہی سمجھا اور پرکھا جاسکتا ہے۔ حیات انسانی ہر عہد میں اخلاقی اوامر ونواہی کی پابند رہی ہے۔ معاشرے کی سرگرمیوں کا انسانی زندگی پر اثر انداز ہونا ایک فطری امر ہے اور اسی سے اخلاقی روایتوں کی سمتوں کا تعین ہوتا ہے۔ فن کار و ادیب کی دانشوری سمت نمائی کا کام انجام دیتی ہے۔ اگر دانشوروں کا یہ طبقہ اپنی تیسری آنکھ کا استعمال ترک کردے تو پھر خیر وشر کے مابین امتیاز کا شعور بھی بتدریج معدوم ہوتا چلا جائے گا، تاریکیاں اور مایوسیاں گہراتی جائیں گی اور معاشی بلندیوں اور پستیوں کی پہچان بھی کسی میں باقی نہیں رہے گی۔

(قمر اعظم ہاشمی، پیش لفظ مجموعہ ''مضامین''، مطبوعہ ۱۹۹۸ء)

ذکر املا

زبیر احمد بھاگلپوری
Urdu Section, Bihar Legislative Council, Patna - 800015 (Mob.9334899643)

اردو املا: ایک بازدید

کوئی بھی زبان بہتے ہوئے دریا کی طرح وقت کے دھارے کے ساتھ لفظیاتی یا املائی سطح پر ردو قبول کے مراحل سے گزرتے ہوئے اپنے ارتقائی سفر کی منازل طے کرتی رہتی ہے۔ اس کے اس فطری مزاج پر یوں تو قواعد کی توضیع کے ذریعہ قدغن لگانا ممکن نہیں، لیکن اس کی سمت و رفتار کو صحیح نہج عطا کرنے کے لئے ماہرین لسانیات کے ذریعہ معقول اصولوں کی تعیین اور مناسب سفارشات کی پیش کش بھی ضروری ہے، تاکہ اہل زبان میں لسانیاتی سطح پر یکسانیت قائم ہو سکے۔ اردو املا کا معاملہ بھی اس اصول سے جدا نہیں۔ اگر امیر خسرؔو (۱۲۵۳-۱۳۲۵ء) کی ''ہندوی'' کو اردو زبان کا نقش اول تسلیم کرلیں تو گزشتہ تقریباً ۷۰۰ برسوں کے دوران سیکڑوں اردو الفاظ متروک قرار پاگئے اور سیکڑوں کے املا نے نئے رنگ وروپ دھارن کر لئے، مثلاً اردو میں ایک کثیر الاستعمال لفظ ''سے'' ہے جو تقریباً سو سال قبل کہیں ''سیں'' تھا اور کہیں ''سوں''، بقول محی الدین قادری زورؔ قطب شاہی بادشاہ محمد قلی اور اس کے درباری شعرا کے کلام میں ''سے'' کی جگہ لفظ ''تھے'' ہی نظر سے گزرتا ہے، جب کہ وجہیؔ سے قبل تمام اردو تحریروں میں یہ 'تے' لکھا جاتا تھا۔ اس طرح لفظ 'کہنا' کو ''کہیو'' اور جزو جملہ ''چلتے ہو'' کو 'چلو ہو' ابھی حال کے دنوں تک استعمال کیا جاتا رہا ہے۔ میرؔ کے ذریعہ مستعمل ''کبھو'' اور ''کسو'' اب ''کبھی'' اور ''کسی'' بن چکا ہے۔ تغیر کا یہ فطری لسانیاتی عمل آج بھی جاری ہے۔

فطری طور پر املائی تغیرات کے مسلسل جاری رہنے والے اس عمل کے دران ہی لسانیاتی انتشار سے تحفظ اور املائی یکسانیت قائم کرنے کے لئے منطقی بنیاد پر متعلقہ قواعد وضوابط کا تعین ایک لازمی امر ہے۔ اسی تقاضے کے مدنظر اردو میں اصلاحِ املا کی باقاعدہ مہم ۱۹۴۳ء میں شروع ہوئی جس کی شروعات کا سہرا بجا طور پر پروفیسر عبدالستار صدیقی کے سر باندھا جاتا ہے۔

عبدالستار صدیقی کی جائے پیدائس اور تاریخ پیدائش کے حوالے سے مختلف روایتیں ملتی ہیں۔ ان کے دوسرے صاحب زادے زبیر صدیقی کے مطابق عبدالستار صدیقی کی پیدائش ۲۵ دسمبر ۱۸۸۵ء کو لکھنؤ کے قریب ضلع پروڈی کے سندیلہ قصبہ میں ہوئی، جب کہ ان کے پہلے صاحب زادے مسلم صدیقی کے مطابق متذکرہ تاریخ کو ہی ان کی پیدائش یوپی کے ضلع ہردوئی میں ہوئی، لیکن "Gottingen University" میں اپنے تحقیقی مقالے کے ساتھ جو تاریخ پیدائش خود عبدالستار صدیقی نے بتائی ہے وہ ۲۶ دسمبر ۱۸۸۶ء ہے۔ بہرکیف عبدالستار صدیقی اردو، ہندی، فارسی، عربی، سنسکرت اور انگریزی زبانوں میں تعمق رکھنے کے علاوہ عبرانی، سریانی، لاطینی، جرمن اور ترکی جیسی قدیم زبانوں کا بھی درک رکھتے تھے، لیکن اردو املا کی معیار بندی کے حوالے سے تمام اردو عوام وخواص کو اس حقیقت کا اعتراف کرنا چاہئے کہ چند اہم مقالے لکھ کر اور اردو عوام کو اس موضوع پر یکجا کر کے انہوں نے املائی تفکر وتدبر کی مہم کا آغاز ضرور کیا، لیکن عملی اور فکری طور پر اس اہم کام کو پایۂ تکمیل تک پروفیسر رشید احمد خاں نے ''اردو املا'' جیسی اہم تاریخی کتاب تصنیف کر کے پہنچایا۔ اس کے بعد اردو املا کے عنوان پر جتنے بھی مقالے یا کتابچے معرض وجود میں آئے، سبھوں نے اس کتاب سے استفادہ کیا، یہاں تک کہ ترقی اردو بیورو، نئی دہلی کے زیر اہتمام اور گوپی چند نارنگ کے زیر ترتیب ۱۹۷۴ء میں (پہلا ایڈیشن) اور ۱۹۹۰ء میں شائع ہونے والے ''املا نامہ'' کے دوسرے نظر ثانی شدہ ایڈیشن میں بھی رشید حسن خاں کے تحقیقی کاموں سے استفادہ کیا گیا، جس کا اعتراف خود گوپی چند نارنگ ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''رشید حسن خاں نے اردو املا پر عالمانہ اور مبسوط کتاب
لکھی جس میں بنیادی اصولوں کی وضاحت کی گئی، مختلف

عنوانات کے تحت ضروری الفاظ کی فہرستیں شامل کی گئیں اور لغات میں پائے جانے والے انتشار اور غلط نگاری کا جائزہ لے کر ترجیحی صورتوں کا تعین کیا گیا، لیکن واضح رہے کہ یہ کتاب ایک فرد واحد کا کام ہے۔ کمیٹی نے ان کے کام اور ان کے مشوروں سے استفادہ کیا۔''

تاریخی پس منظر

انجمن ترقی اردو (ہند) کے مجلّہ ''اردو'' (جو بعد میں ''اردو ادب'' ہوا) کے اکتوبر ۱۹۲۳ء کے شمارے کے اداریہ سے خلاصہ ہوتا ہے کہ اصلاح املا کے حوالے سے یہی وہ وقت تھا جب ایک ساتھ بشمول عبدالستار صدیقی اردو کے کئی ماہرین لسانیات اردو املا کی اصلاح کے لئے فکرمند ہوا ٹھے جن میں ایک نام مولانا احسن مارہروی کا بھی ہے۔

متذکرہ رسالے میں اردو املا سے متعلق عبدالستار صدیقی کا مضمون بعنوان ''اردو رسم خط میں اصلاح'' شائع ہوا ہے، لیکن اس اداریہ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اس عنوان پر مزید کئی مضامین اردو کے مختلف رسالوں میں شائع ہو چکے تھے جس کے نتیجے میں املا کے مسائل کے تصفیہ کے مقصد سے حیدرآباد میں ایک اجلاس کا انعقاد ہوا تھا جس میں عبدالستار صدیقی، مولوی عنایت اللہ صاحب، مولوی سید ہاشمی صاحب، مولوی وحید الدین سلیم، سید احمد علی صاحب اور عبدالحق صاحب وغیرہ شامل تھے۔ اس اجلاس میں اردو املا کے مسائل کے تدارک کے لئے شاید پہلی بار چند تجاویز ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کے ذریعہ پیش کی گئیں جنھیں شرکائے مجلس نے اتفاق رائے سے قبول کر لی تھی۔ یہی وہ مختصر اجلاس تھا جسے اصلاح املا مہم کا باضابطہ اجتماعی آغاز قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس مہم کی ترقی یافتہ شکل کے بطور تقریباً ۲۰ سال بعد انجمن ترقی اردو کے زیر اہتمام ۲۲ مارچ ۱۹۴۳ء کو انجمن کے دریا گنج، دہلی واقع دفتر میں ہونے والے اجلاس اور ۲۱ جنوری ۱۹۴۴ء کو ناگپور میں اس عنوان پر منعقد کانفرنس کو دیکھا جا سکتا ہے۔

رسم الخط اور املا

۱۹۴۳ میں انجمن کی جس کمیٹی کے تحت اصلاح املا سے متعلق عبدالستار صدیقی نے روداد پیش کی تھی، اس کا نام ہی تھا ''کمیٹی اصلاح رسم خط''، جب کہ ۱۹۴۴ میں مولوی سید ہاشمی فرید آبادی کا ایک مضمون رسالہ ''اردو ادب'' میں شائع ہوا تھا، اس کا عنوان تھا ''اصلاح رسم خط'' معاملہ چونکہ ''املا'' کا چل رہا تھا، اس کی جگہ ''رسم خط'' استعمال کرنے پر کچھ ماہرین چیں بجبیں ہوئے۔ رشید حسن خاں نے اسے خلط مبحث قرار دیتے ہوئے پہلی بار بتایا کہ رسم الخط اور املا دو الگ الگ چیزیں ہیں۔

معاملہ دراصل یہ تھا کہ ''رسم الخط'' اپنے وجود کے ابتدائی دنوں میں ایک عام لفظ کے بطور استعمال ہوتا تھا۔ لغوی طور پر اس کے معنی کسی حد تک ''املا'' سے ملتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان اکابر نے ''املا'' کی جگہ ''رسم خط'' استعمال کیا، لیکن رشید حسن خاں کے وقت تک پہنچتے پہنچتے ''رسم الخط'' ایک مخصوص معنی اختیار کرتے ہوئے ایک اصطلاح بن چکا تھا جس کا آج انگریزی متبادل ''Script'' اور ہندی متبادل ''लिपि'' ہے۔

املائی تغیر ایک عمل پیہم (Continuous Process) ہے یہی وجہ ہے کہ انجمن ترقی اردو (ہند) کے ذریعہ ۱۹۴۳ء اور ۱۹۴۴ء میں پیش کردہ کئی املائی سفارشات رتجاویز تقریباً ۳۰ سال بعد یعنی ترقی اردو بیورو، نئی دہلی کے زیر اہتمام ۱۹۷۴ء میں گوپی چند نارنگ کے ذریعہ مرتب ''املا نامہ'' کی سفارشات تک پہنچتے پہنچتے ناقابل اعتنا قرار دے دی گئیں۔ یہی نہیں ۱۹۷۴ میں شائع ''املا نامہ'' (طبع اول) کی ہی کئی سفارشات کو ۱۹۹۰ء میں شائع املا نامہ کے نظر ثانی شدہ ایڈیشن میں غیر مروج قرار دے دیا گیا۔ جیسے الف مقصورہ والے زیادہ تر الفاظ کو اس ایڈیشن میں برقرار رکھا گیا۔ اسی طرح طشت، طشتری، طمانچہ، طوطی وغیرہ الفاظ کو دوسرے ایڈیشن میں ''ط'' سے ہی لکھنا قبول کر لیا گیا۔ اس کے علاوہ گانو، پانو، چھانو کی بجائے گاؤں، پاؤں، چھاؤں کے استعمال کو ہی صحیح قرار دیا گیا۔ اسی طرح حاصل مصدر بچاؤ، بناؤ، بہاؤ میں ہمزہ کے استعمال کو مناسب قرار دیا گیا جو پہلے غیر مناسب تھا۔ ''املا نامہ'' کی کون کون سی سفارشات آج مقبول اور مروج ہیں اور کون کون سی متروکات میں شامل ہو چکی ہیں، ان کا سرسری جائزہ آگے لیا جائے گا۔ ۱۹۷۴ میں ''املا نامہ'' کی اشاعت کو اب ۵۰ سال ہو چکے۔ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ اس مدت کے دوران اردو املا میں کیا تغیرات رونما ہوئے، کن سفارشات کو قبول کیا گیا اور کن سفارشات کو رد کیا گیا، ان کی باضابطہ نئی

اصلاح املا کمیٹی کے ذریعہ نشاندہی کی جائے۔ صرف یہی نہیں، آج اردو زبان ایک بین الاقوامی زبان کی حیثیت اختیار کرچکی ہے، اس لئے ضرورت ہے کہ اردو املا کی معیار بندی کے حوالے سے پاکستان میں جو کام ہوئے ہیں، ان سے بھی ہم آہنگی پیدا کی جائے تاکہ عالمی سطح پر اردو املا میں یکسانیت قائم ہوسکے۔

نئی سفارشات درکار

واضح ہو کہ جس طرح ہمارے ملک میں کئی نشستوں کے بعد ۱۹۷۴ء میں املا کی معیار بندی کے لئے ''املا نامہ'' کے نام سے سفارشات شائع ہوئیں، اسی طرح پاکستان میں بھی کئی دنوں کے مباحثے کے بعد املا کی معیار بندی اور اس کے انضباط کے لئے ۲۴ سفارشات منظور کی گئیں جو جنوری، ۱۹۸۶ء کے رسالہ ''اخبار اردو'' میں شائع ہوئیں۔ ایک ہی نوعیت کا کام سرحد کی دونوں طرف ہوا، لیکن آپسی رابطہ اور ہم آہنگی نہیں ہونے کے سبب کئی مقامات پر اختلافات اور انتشار کی کیفیت پیدا ہوگئی۔ جیسے ہندوستان میں منعقد املا کمیٹی اور ورکشاپ میں ماہرین املا نے متفقہ طور پر یہ اصول وضع کیا کہ جن الفاظ کا املا مروج عام ہوچکا ہو، اس میں ردو بدل کی ضرورت نہیں۔ پاکستان میں بھی اسے قبول کیا گیا، لیکن کئی سفارشات میں چلن اور رواج کو تسلیم نہیں کیا گیا۔ جیسے 'کلیۃ'' اور ''ارادۃً'' میں تنوین کو مدور لکھنے کی سفارش کی گئی۔ اس طرح گزارش، گزرنا، اور خدمت گزار جیسے الفاظ کو ''ذ'' سے لکھنے کی تاکید کی گئی جو ہندوستانی سفارشات کے خلاف ہے۔ اس قسم کے انتشار سے اردو املا کو محفوظ رکھنے کے لئے اب ضروری ہوگیا ہے کہ نہ صرف برصغیر ہندو پاک کے تمام متعلقہ اداروں اور ان کی کارگزاریوں کے درمیان تطبیق پیدا کی جائے، بلکہ سرحد کی دونوں طرف کے ماہرین کی مشترکہ املا کمیٹی کے ذریعہ آج عصری املا کا سائنسی اور منطقی جائزہ لے کر تازہ ترین سفارشات ''اردو املا'' کے زیرعنوان ہی پیش کی جائیں۔

املا کی معیار بندی بھی توضیحی لسانیات (Synchronic linguistics) کی دیگر اصول سازی کی طرح ایک اہم اور نازک عمل ہے۔ اس میں جن نکات کو مدنظر رکھا جاتا ہے، ان میں سب سے اہم رواج عام یا چلن کو محفوظ رکھنا ہے۔ تقریباً تمام دانشوران اردو نے اس اصول کو قبول کرلیا ہے کہ لفظ چاہے جس زبان کا ہو، اردو میں دخیل ہو کر وہ جو بھی معنوی اور صوری حیثیت اختیار کرکے مروج عام ہو جاتا ہے، اسے ہر حال میں محفوظ رکھنے کی ضرورت ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اگر مروجہ اور مرجح الفاظ کو معنوی یا صوری طور پر درست کرکے پیش کیا جائے تو اس کی عوامی سطح پر قبولیت کا امکان نہیں کے برابر ہوتا ہے۔ یہی سہو انجمن ترقی اردو (ہند) کے ذریعہ ۱۹۴۳ اور ۱۰۴۴ میں اردو املا کے حوالے سے پیش کردہ سفارشات کے تعلق سے ہوا۔ انہوں نے اپنی تجاویز میں بہت سے مروج عام الفاظ کو درست کرنے کی سفارشات کیں جس کا نتیجہ ہوا کہ عام اردو آبادی کی بات تو دور، خود ۱۹۷۴ میں 'املا نامہ'' کے نام سے پیش ترقی اردو بیورو کی نئی سفارشات میں انجمن کی بہت سی سفارشات کو مسترد کردیا گیا۔ ویسے بھی اردو میں 'غلط العام فصیح' کا اصول تسلیم شدہ ہے۔ اس سلسلے میں تمام اردو علما متفق ہیں۔ انشاء نے ''دریائے لطافت'' میں جو نظریہ پیش کیا ہے۔ اس کا اردو ترجمہ سیاق کے موافق ہے:

> ''جاننا چاہئے کہ جو لفظ اردو میں آیا، وہ اردو ہو گیا، خواہ وہ لفظ عربی ہو یا فارسی، ترکی ہو یا سریانی، پنجابی ہو یا یوروپی، اصل کی رو سے غلط ہو یا صحیح، وہ لفظ اردو کا لفظ ہے۔ اگر اصل کے موافق مستعمل ہے تو بھی صحیح اور اگر اصل کے خلاف ہے تو بھی صحیح۔ اس کی صحت اور غلطی اس کے اردو میں رواج پکڑنے پر منحصر ہے۔''

انگریزی اور ھندی املا میں عدم یکسانیت

عدم یکسانیت کا مسئلہ صرف اردو املا کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ دنیا کی تقریباً ساری اہم زبانوں میں یہ مسئلہ موجود ہے، مثلاً دنیا میں سب سے زیادہ بولی جانے والی زبان انگریزی ہی کو لے لیجئے۔ برطانوی انگریزی کا جو قدیم املا ہے، حق تصرف کے تحت امریکن انگریزی میں بہت سے مقامات پر اسے سہل کاری (Symplification) کے نام پر تبدیل کردیا گیا ہے۔ چند مثالیں درج ذیل ہیں:

British English	American English
(re)	(er)
centre	center
fibre	fiber

theatre	theater
litre	liter
(our)	**(or)**
colour	color
flavour	flavor
humour	humor
labour	labor
(oe/ae)	**(e)**
manoevre	manever
paediatric	pediatric
leukaemia	leukemia
(ll)	(l)
travelling	traveling
travelled	traveled
traveller	traveler
fuelled	fueled
fuelling	fueling
(ce)	(se)
defence	defense
licence	lincense
offence	offense
pretence	pretense

اردو اور ہندی دونوں زبانوں کا تعلق ایک ہی خاندان السنہ (ہند آریائی) سے ہے اور دونوں میں مستعمل بہت سے الفاظ مشترک ہیں۔ جیسے، بیٹھئے، چلئے، کیجئے، لیجئے اور چاہئے وغیرہ۔ ان جیسے درجنوں الفاظ کے درست املا کے تئیں ہندی اردو دونوں کے ماہرین نے تجاویز پیش کی ہیں۔ جیسے میتریہ پبلی کیشن ،نئی دہلی نے آچاریہ کشوری داس واجپئی کی کتاب ''हिन्दी शब्द मीमांसा'' ۲۰۰۶ میں شائع کی ہے جس میں انہوں نے مذکورہ نوعیت کے کئی الفاظ کا درست املا پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

کتاب ہذا کے صفحہ نمبر ۱۵۱ پر ان کا ایک مختصر پیراگراف قابل توجہ ہے:

''ہندی میں ''बैठिए–बैठिये'' اور ''चलिए–चलिये''
وغیرہ دونوں شکلیں چل رہیں ہیں۔ یہاں بھی 'य' اسی
طرح آ کودا ہے ۔درست شکل ہیں — बै ठि ए،
चलिए وغیرہ۔'बैठिये' وغیرہ غلط ہیں۔''

اگر واجپئی جی کے مشورے کے مطابق ان الفاظ کو درست طریقے سے اردو میں لکھیں تو یوں لکھا جائے گا— بیٹھئے، چلئے، اٹھئے، اور پڑھئے وغیرہ، جب کہ انہی الفاظ کے تعلق سے ''املا نامہ'' (گوپی چند نارنگ) میں جو سفارش کی گئی ہے، اس کے مطابق اس نوع کے الفاظ کا درست املا یوں ہے: 'دیجیے، لیجیے، کیجیے، اٹھیے، بیٹھیے وغیرہ یعنی آخری حرف ''ے'' بغیر ہمزہ کے لکھا جائے گا۔

مذکورہ پیراگراف سے دو نقطے واضح طور پر سامنے آتے ہیں۔ اول یہ کہ واجپئی جی قبول کر رہے ہیں کہ ہندی املا میں بھی عدم یکسانیت کا مسئلہ موجود ہے۔ دوم یہ کہ اردو اور ہندی دونوں کی املا نویسی کے حوالے سے سفارشیں مختلف ہیں۔ ایسی صورت حال میں اگر دونوں زبانوں کے ماہر اکٹھے بیٹھ کر مشترک الفاظ کے املا کی معیار بندی کی کوشش کریں تو اس سے نہ صرف اردو۔ ہندی زبانوں میں املائی یک جہتی آئے گی بلکہ اس سے ہندوستانی سماج میں بھی یک جہتی اور خیر سگالی کا پیغام جائے گا۔

انتشار کے اسباب

دہلی اسکول اور لکھنو اسکول کی آپسی ادبی چپقلش ظاہر ہے جو اردو میں املائی انتشار کا سبب بنی۔ دہلی والے ''مصالح'' تو لکھنؤ والے ''مسالا' اسی طرح اہل دہلی 'پانو' تو حضرات لکھنؤ ''پانوں'' لکھتے رہے۔ دبستانی املائی اختلافات کے علاوہ خود ماہرین املا کے درمیان املائی انتشار پائے جاتے تھے جس کی تفصیلات ''اردو املا'' میں رشید حسن خاں نے عالمانہ اور تحقیقی انداز میں پیش کر دی ہیں۔ اردو کے لغت نویسوں نے بھی املائی انتشار پیدا کرنے میں اہم رول ادا کیا۔ اس انتشاری کیفیت کی سنگینی اور شدت کو گہرے طور پر محسوس کرنے کے سبب ہی بیسویں صدی کے نصف اول میں ماہرین لسانیات کی ایک مقتدر جماعت اس مسئلے کے ازالے کے لئے بیک وقت سرگرم ہوگئی جس کے نتیجے میں انجمن ترقی اردو (ہند) کے ذریعہ ۴۴-۱۹۴۳ء میں اور پھر ترقی اردو بیورو، نئی دہلی کے ذریعہ ۱۹۷۴ء میں املائی یکسانیت قائم کرنے کے مقصد کے تحت اصلاح املا کے لئے انتہائی اہم سفارشات پیش کی جا سکیں۔

املا کی معیار بندی ایک انتہائی نازک عمل ہے اور اس سے متعلق تجاویز پر مکمل عمل درآمد اس سے بھی زیادہ کار دشوار ہے۔ ''املا نامہ'' (۱۹۷۴) اس نازک مسئلے کے حوالے سے اس لئے انتہائی اہم ہے کہ

طویل بحث ومباحثے کے بعد اردو املائی اصلاح کے لئے ''ترقی اردو بیورو'' جیسے اہم ادارے کے ذریعہ ایجازاً مگر انتہائی اہم اور مبسوط سفارشیں کتابی شکل میں پیش کی گئیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اتنی اہم سفارشات کو صد فیصد عملی جامہ کیوں نہیں پہنایا جاسکا۔ اس کے بھی کئی اسباب تھے جن میں اہم ترین یہ تھا کہ ان سفارشات کو اردو کے گراس روٹ لیول تک موثر اور منطقی انداز میں ترسیل کی ذمہ دار اداروں کے ذریعہ کوشش نہیں ہوسکی۔ بالفاظ دیگر اگر ان سفارشات کو منظّم طریقے سے ادارے، اساتذہ اور ذمہ دار عہدیداران کے ذریعہ اردو کے ابتدائی درجوں کے طلبہ تک پہنچا دیا جاتا تو شاید آج ان سفارشات پر ہم بڑی حد تک عمل درآمد ہوتے دیکھتے۔ متذکرہ پیرا میں ان سفارشات پر از سرنو غور وفکر کی وکالت میں نے اس لئے کی کہ آج اہل اردو کے درمیان بہت سے اردو الفاظ کا وہ املا مروج ہو چکا ہے جس کی سفارش نہیں کی گئی تھی۔ مثالاً ان میں سے چند الفاظ درج ذیل ہیں:

سفارش	رواج	سفارش	رواج
ان جان	انجان	بیٹھیے	بیٹھئے
بھروسا	بھروسہ	لیجیے	لیجئے
پولیس	پولیس، پولس	چاہیے	چاہئے
تمغا	تمغہ	دیجیے	دیجئے
تمھارا	تمہارا	دیجیے	دیجئے
رحمان	رحمٰن	کیے	کئے

میں نے اپنے صواب دید کی بنیاد پر مذکورہ چند مثالیں پیش کی ہیں جو خلاف سفارش مروج ہوچکی ہیں۔ ممکن ہے قارئین میں سے کچھ میرے اس نظریہ سے متفق نہ ہوں۔

طریق نفاذ

اردو میں املائی عدم یکسانیت کے مسئلے کے تدارک کے لئے لازمی ہے کہ اگر کسی مستند ادارے نے املائی یکسانیت کے لئے ماہرین سے مشورے اور بحث کے بعد متفقہ طور پر کوئی سفارش رتجویز پیش کی ہے تو خواص وعوام تمام اہل اردو کو اس کی تائید اور پیروی کرنی چاہئے۔ ایسا نہیں ہو کہ متذکرہ سفارش سے جزوی یا فروعی اختلاف کے سبب ذاتی طور پر مقالے یا کتابی شکل میں اپنا نظریہ پیش کیا جائے۔ ہندستان میں، جیسا کہ ذکر کیا گیا، دو اہم ادبی ولسانی ادارے نے اپنے اپنے وقت پر صلاح ومشورہ کے بعد املائی سفارشات پیش کیں، لیکن اس کے ساتھ ہی ذاتی طور پر اس عنوان پر کام کیا گیا۔ جیسے مقالے کے طور پر ''فکر وتحقیق'' اور ''کتاب نما'' نئی دہلی میں وقتاً فوقتاً اس عنوان پر تحریریں شائع ہوتی رہیں۔ ادھر ''اردونامہ'' (کراچی) میں بھی متعلقہ موضوع پر مضامین شائع ہوتے رہے۔ اس کے علاوہ کئی کتابیں بھی اس موضوع پر ذاتی کاوش کے نتیجے میں معرض وجود میں آئیں، جن میں سید مسعود حسن رضوی ادیب کی ''اردو زبان اور اس کا رسم الخط'' (قبل ۱۹۴۸ء)، عبدالقدوس ہاشمی کی ''ہمارا رسم الخط'' (قبل ۱۹۴۷ء) اور محمد الیاس برنی کی ''اردو ہندی رسم الخط'' حیدرآباد (۱۹۴۶ء) اہم ہیں جو ۱۹۵۰ سے قبل ہی شائع ہوچکی تھیں۔ ہمیں نہیں معلوم کہ ان مقالات اور کتابوں میں انجمن ترقی اردو کی سفارشات کی کس قدر پاسداری کی گئی، لیکن املائی یکسانیت کے لئے ضروری ہے کہ مستند ادارے کے ذریعہ جاری تجاویز پر عزت دیتے ہوئے متفقہ طور پر عمل درآمد ہو۔ اس کے علاوہ ابتدائی سطح پر بچوں میں درست املا کی ترسیل بھی انتہائی ضروری ہے۔ ریاستی سطح پر بچوں کے لئے جو درسی کتابیں سرکاری یا غیر سرکاری طور پر شائع کی جاتی ہیں، اس میں اردو املا کی وہ کتاب بھی لازمی طور پر شامل کی جائے جو صحیح املا کے ساتھ مرتب کی گئی ہو، مگر اس اہم کام کے لئے پہلے تو خود کتاب کے مرتبین کو درست املا کی جانکاری دینی ہوگی۔ اس کے لئے اردو کے اعلیٰ اداروں کو اردو اساتذہ کے لئے تربیتی ورکشاپ کا وقتاً فوقتاً انعقاد کرنا ہوگا اور تمام اردو عوام میں اپنی زبان اور اس کے املا کے تئیں بیداری پیدا کرنی ہوگی۔

(دریائے لطافت: انشاء اللہ خاں، اردو املا: رشید حسن خاں، اردو میں لسانی تحقیق: پروفیسر عبدالستار دلوی، املا نامہ: گوپی چند نارنگ، اردو لسانیات: علی رفاد فتیحی، زبان اور قواعد: رشید حسن خاں، لغات روزمرہ: شمس الرحمٰن فاروقی، ''اردو ادب'' انجمن ترقی اردو (ہند) (جولائی، ۲۰۲۳ تا مارچ ۲۰۲۴)، وضع اصطلاحات: وحید الدین سلیم، مقدمہ تاریخ زبان اردو (۱۹۴۸): مسعود حسین خاں، اردو کا صوتی نظام: محبوب عالم خاں (مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد)، हिन्दी शब्द मीमांसा : आचार्य किशोरी दास वाजपेयी سے اخذ واستفادہ کے ساتھ)

افسانے

فاضل شفیع بٹ

Akangam, Anant Naag (Mob. 9971444589)

بنجر پور کا قبرستان

''بابا آپ میری رائے ماننے سے کیوں قاصر ہیں؟ دیکھو، اب میں ہرگز اس گاؤں میں نہیں رہ سکتا۔ یہ گاؤں ایک سنسان اور جنگلی علاقے میں واقع ہے۔ نہ سڑک ہے، نہ اسکول ہے، نہ بجلی ہے، نہ صاف پانی کا کوئی انتظام ہے اور پھر نیٹ ورک کا مسئلہ۔ گویا یہ گاؤں ایک ویرانہ ہے جہاں سرسبز پیڑ پودوں کی ہریالی اور ان پرانے دیودار کے درختوں کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔'' فیض اپنے والد رحیم خان کے سامنے اپنا گاؤں چھوڑ کر شہر کے نزدیک ہجرت کرنے کی ضد پر اڑا تھا۔

''دیکھ فیضے! تو میرا لختِ جگر ہے۔ میں نے اس گاؤں میں زندگی کے ساٹھ برس گزارے ہیں۔ اس گاؤں کی مٹی کے ساتھ میری یادیں، میرا بچپن، میری جوانی منسلک ہے۔ مجھے اس گاؤں کی مٹی سے بے حد لگاؤ ہے۔ اس مٹی کی خوشبو میری روح کو تروتازہ کرتی ہے۔ میں مانتا ہوں کہ یہ گاؤں ترقی یافتہ نہیں ہے، لیکن کیا تیری پرورش میں کوئی کمی پیش آئی؟ کیا تم اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے سے قاصر رہے؟ تمہیں سرکاری نوکری کیا ملی، تم نے اپنے تیور ہی بدل ڈالے۔ کیا تم گاؤں کے پرسکون اور صاف و شفاف ماحول کو لات مار کر شہر کی آلودگی میں رہنا پسند کروگے؟'' رحیم خان کے لہجے میں التجا بھی تھی اور سوال بھی۔

''نہیں بابا۔ ایسا بالکل بھی نہیں ہے۔ مجھے آپ سے پوری ہمدردی ہے۔ میں آپ کا خون ہوں۔ آپ مجھے سمجھتے کیوں نہیں؟ میں شہر میں رہنے کی بات نہیں کر رہا ہوں۔ ہم شہر کے مضافات میں سکونت اختیار کر لیں گے۔ اب زمانہ بدل چکا ہے۔ اب انٹرنیٹ اور موبائل فون کا زمانہ ہے۔ وقت نے بڑی تیزی سے کروٹ لی ہے۔ میں آپ کو اور اماں جی کو اپنے ساتھ رکھنا چاہتا ہوں۔ دوسری جانب مجھے اپنے بچوں کے مستقبل کی فکر کھائے جا رہی ہے۔ بابا آج کل اسکول کے بعد بچوں کی آن لائن کلاسز ہوتی ہیں جو کہ اس گاؤں میں ممکن نہیں۔ مجھے بھی اپنے گاؤں بنجر پور سے بے حد پیار ہے۔ میرے ماضی کی یادیں بنجر پور سے جڑی ہوئی ہیں۔ بنجر پور سے دوری میرے دل میں ہمیشہ یادوں کی کسک بن کر مجھے بہت ستائے گی، لیکن میں مجبور ہوں۔ بنجر پور کو چھوڑنے کے علاوہ کوئی چارہ بھی تو نہیں ہے۔ میں اپنے بچوں کے مستقبل کے ساتھ کھلواڑ نہیں کر سکتا۔ بابا میری بات مان لیں۔ یہاں کی ساری جائیداد بیچ کر ہم شہر کے مضافاتی علاقے میں آرام سے اپنی زندگی بسر کریں گے۔''فیض نے قدرے اطمینان سے اپنے والد کو رضامند کرنے کی کوشش کی۔

فیض شہر سے تقریباً سو میل کی دوری پر پہاڑی علاقے میں واقع ایک چھوٹے سے گاؤں بنجر پور میں رہتا تھا۔ بنجر پور کے چاروں طرف سرسبز اور گھنے جنگل تھے۔ شہر جانے کے لیے جنگل سے ایک نیم پختہ پگڈنڈی کو عبور کر کے چھوٹے سے اسٹاپ سے گاڑی مل جاتی تھی۔ تعلیم حاصل کرنے کے فوراً بعد فیض کو ایک سرکاری نوکری ملی اور شہر کے ایک دفتر میں تعینات ہوا۔ فیض شہر میں ایک کرایے کے مکان میں رہنے لگا اور ہفتے میں ایک آدھ بار گھر آ کر اپنے بوڑھے والدین کی خبر گیری کرتا رہتا تھا۔ فیض نے والدین کی مرضی کے مطابق شہر میں ہی شادی کر لی۔ شادی کے بعد بھی فیض مسلسل بنجر پور آتا جاتا رہا۔ دفتری کام اور بچوں کی تعلیم کے مسئلے نے فیض کو بنجر پور کو الوداع کہنے کے لیے مجبور کیا، لیکن یہ کام اتنا آسان نہ تھا۔ یہ کام والدین کی مرضی کے برعکس نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ان کو اعتماد میں لینا فیض کے لیے کافی مشکل کام تھا اور فیض نے نہایت ہنرمندی کا اظہار کر کے بالآخر اپنے والدین کو بنجر پور سے ہجرت کر کے شہر کے مضافاتی علاقے میں ایک مکان خریدنے کے لیے رضامند کر لیا۔

بنجر پور سے رحیم خان کی ہجرت سے ایک خلا سا پیدا ہوا

تھا۔ لوگ رحیم خان کے جانے سے کافی دل برداشتہ تھے۔ رحیم خان گاؤں میں ایک معزز انسان کی حیثیت رکھتا تھا۔ گاؤں میں کسی بھی مسئلے کو لے کر لوگ رحیم خان سے رائے پوچھتے تھے۔ رحیم خان بنجر پور کا ایک چہیتا آدمی تھا۔ رحیم خان کا بنجر پور سے ہمیشہ کے لیے ناتا توڑنا گویا بنجر پور کی آبادی کو بے سکون کرنے کے مترادف تھا۔ بنجر پور کے لوگوں کی آنکھیں نم تھیں۔ رحیم خان کے دوست واحباب اس سے بیزار تھے۔ لوگ رحیم خان کو گلے سے لگا کر زار و قطار رو رہے تھے۔ بنجر پور کا ہر فرد رحیم خان اور اس کے اہل وعیال سے آخری بار مل رہے تھے۔ رحیم خان جنگل کی پگڈنڈی پر بوجھل قدموں کے ساتھ شاید آخری بار چل رہا تھا۔

بس اسٹاپ سے رحیم خان کے لیے ایک نئے سفر کا آغاز ہوا۔ ایک ایسا سفر جس کے بارے میں رحیم خان نے کبھی سوچا بھی نہ ہوگا۔ ایک ایسا سفر جس کی شروعات اس کی زندگی کے آخری لمحات سے ہوئی تھی۔ رحیم خان نے اپنے دل پر پتھر رکھ کر فیض کا دل جیت لیا تھا۔ اپنی خوشی اور سکون کا گلا گھونٹ کر اپنے بیٹے کی خوشنودی کے لیے ایک عظیم قربانی کا فریضہ انجام دیا تھا۔

شہر کے مضافات میں فیض نے بنجر پور کی ساری جائیداد بیچ کر ماڈرن کالونی میں ایک عمدہ گھر خرید لیا تھا۔ نئے گھر میں ہر طرح کی سہولیات دستیاب تھی۔ لابی میں نئے صوفے، ایک بڑا اسمارٹ ٹیلی ویژن اور مصنوعی پھول دان سجے ہوئے تھے۔ فیض خوشی سے پھولے نہ سما رہا تھا۔ آج وہ اپنے ہمراہ والدین کو اپنے عالیشان بنگلے میں لا رہا تھا، جو اس کی ایک آرزو تھی۔ فیض اپنے والدین کا ایک فرمانبردار بیٹا تھا جس کا دل ماں باپ کی شفقت اور محبت سے لبریز تھا۔ رحیم خان ماڈرن کالونی میں قدم رکھتے ہی ایک الگ دنیا میں چلا گیا۔ اتنے عالیشان بنگلے رحیم خان نے کبھی نہ دیکھے تھے۔ رحیم خان کافی دیر تک نئے نئے بنگلوں کو دیکھتا رہا اور اسی اثناء میں فیض اپنے والد سے مخاطب ہو کر کہنے لگا:

''بابا......بابا! کہاں کھو گئے؟ یہ دیکھو اپنا مکان سامنے ہے۔''

اپنے مکان کے سوا رحیم خان کے لیے ماڈرن کالونی میں سب کچھ پرایا تھا۔ فیض نے عمدہ طریقے سے اپنے ماں باپ کا خیال تو رکھا، لیکن ان کے چہروں پر افسردگی کے نمایاں تاثرات صاف صاف عیاں تھے۔ یہاں کے لوگوں میں بنجر پور کی طرح پیار و محبت نہ تھی۔ لوگ اپنے کام سے کام رکھتے اور ہر کوئی اپنے آپ میں بے حد مصروف تھا۔ فیض صبح آفس کے لیے روانہ ہوتا اور اس کے والدین اس نئے بنگلے کی چار دیواریوں میں قیدی کی طرح اپنی زندگی بسر کر رہے تھے۔ ان کو ٹیلی ویژن سے کوئی لگاؤ نہ تھا۔ کبھی کبھار گھر سے باہر چہل قدمی کے لیے نکلتے تو راستے میں کوئی ان سے بات نہ کرتا، وہ ماڈرن کالونی میں ابھی تک اجنبی تھے۔ فیض کی بیوی بھی فرمان بردار تھی، مگر رحیم خان اور اماں جی کے دل سے ان کے آبائی وطن کی یاد کو نہ نکال سکی۔

رحیم خان کے دل پہ ہجرت کا بڑا اثر گزرا۔ کہاں بنجر پور کی وہ محفلیں اور کہاں ماڈرن کالونی کی تنہائیاں! بنجر پور کا خیال آتے ہی رحیم خان زور زور سے رونا چاہتا تھا، مگر اس کی خشک آنکھوں سے آنسو نکلتے ہی نہیں تھے۔ وہ اپنی زندگی سے بیزار تھا۔ وہ تنہائی کا شکار تھا۔ رحیم خان کو بنجر پور کی ایک ایک بات یاد آ رہی تھی اور بہت ستا رہی تھی۔

گاؤں کے بل کھاتے راستے جن کے ننگے سینوں پر پت جھڑ میں درختوں سے گرے ہوئے زرد پتوں کا قالین بچھا رہتا اور موسم سرما میں وہ راستے سفید برف تلے دب جاتے تھے اور بہار کی آمد کے ساتھ ہی سارے راستے ایک بار پھر سے نمودار ہو جاتے۔ رحیم خان کو بنجر پور کے جنگلوں کی وہ سرسراتی ہوئی ہوا یاد آ رہی تھی جس کی مدھم آواز سے اس پر اکثر نیند غالب آ جاتی تھی۔

رحیم خان زیادہ دنوں تک یہ صدمہ برداشت نہ کر پایا اور اندر ہی اندر بیماری نے رحیم خان کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ کافی علاج و معالجہ کے بعد بھی رحیم خان کی طبیعت میں کوئی سدھار نہ آیا۔

بستر مرگ پر لیٹے رحیم خان کی عیادت کے لیے ماڈرن کالونی سے ایک بھی فرد نے آنے کی زحمت نہ کی۔ بنجر پور سے جڑی اپنے ماضی کی یادوں کے لمس میں رحیم خان کی روح دھیرے دھیرے جسم چھوڑ رہی تھی۔ رحیم خان نے برف کی سفید چادر تلے دبے راستوں اور کھیت کھلیانوں کو آخری بار اپنی آنکھوں اور روح میں اتارنے کی کوشش کی، مگر اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ وہ ہمیشہ کے لیے اس دنیا سے رخصت ہو چکا تھا۔

گھر میں کہرام مچ گیا۔ ماڈرن کالونی میں رحیم خان کے مرنے کی خبر پھیل گئی۔ فیض پرنم آنکھوں سے محلے کے عمر رسیدہ گورکن عیدے کے ہمراہ قبرستان میں اپنے والد کے لیے قبر کھودنے کی تیاریوں میں مصروف تھا کہ اسی اثنا میں ماڈرن کالونی کی محلّہ کمیٹی کے سربراہ حاجی ثناءاللہ نے قہر آلود نظروں سے گورکن عیدے کو دیکھا اور اسے قبر کھودنے سے روک دیا۔ حاجی ثناءاللہ نے تیکھے لہجے میں کہا:

''عیدے......! یہ قبرستان کسی کی ایرے غیرے کی آبائی ملکیت نہیں ہے۔ یہ لوگ پتہ نہیں کہاں سے آکر یہاں آباد ہوئے ہیں؟ اس قبرستان پر ان کا کوئی حق نہیں ہے۔ رحیم خان کسی بھی صورت میں اس قبرستان میں دفن نہیں ہوسکتا، جلدی سے یہ قبرستان خالی کرو۔''

''جناب! یہ قبرستان تو اہل اسلام کی ملکیت ہے اور الحمدللہ ہم مسلمان ہیں۔ ہم آپ کے بھائی ہیں۔ ایسا ظلم نہ کریں۔ حاجی صاحب میرے بابا کی بے جان لاش جنازے کے انتظار میں ہے۔ آپ چاہیں تو محلے کمیٹی میں مجھے بھی شامل کرلیں اور جو بھی رقم طے ہوگی میں ادا کرنے کے لیے تیار ہوں۔'' فیض ثنائاللہ کے سامنے التجا کررہا تھا۔

''نہیں ایسا بالکل نہیں ہوسکتا۔ یہ ہمارے اصولوں کے برعکس ہے۔ ہم قطعی دوسری برادری کی میت کو اپنے قبرستان میں دفن ہونے کی اجازت نہیں دے سکتے۔ جب آپ نے اس بستی میں مکان خریدلیا، اس وقت کہاں تھے؟ اپنی رہائش کا بندوبست کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے مردوں کی تدفین کا بھی بندوبست کیا ہوتا تو کافی اچھا رہتا۔'' حاجی ثناءاللہ کا انکار واضح تھا۔

فیض خان حاجی ثنائاللہ کے سامنے نہایت عاجزی سے گڑگڑایا، مگر حاجی صاحب پر اس کی انکساری بے اثر ثابت ہوئی۔ قبرستان کا دروازہ بند کردیا گیا اور فیض کو وہاں سے نکال دیا گیا۔

رحیم خان کی لاش کو کفن میں لپیٹ لیا گیا۔ محض دو گز زمین کی تلاش تھی۔ فیض ماڈرن کالونی میں پاگلوں کی طرح ہر ایک سے التجا کر رہا تھا۔ وہ اب اپنے بابا کے لیے الگ سے قبرستان خریدنا چاہتا تھا اور اس چیز کے لیے وہ منھ مانگی قیمت دینے کے لیے تیار تھا۔ حاجی ثناءاللہ کو اس بات کی بھنک لگ گئی۔ اس نے ڈھونڈتے ڈھونڈتے فیض کو مسجد کے احاطے میں پایا۔ پیار سے فیض کی پیٹھ تھپتھپائی اور کہنے لگا:

''فیض بیٹے...... میں محلّہ کمیٹی کا سربراہ ہوں اور میں اصولوں کی خلاف ورزی بالکل نہیں کرسکتا۔ میں تمہارے غم میں برابر کا شریک ہوں۔ آپ میرے بیٹے جیسے ہو۔ میری مجبوری کو سمجھو۔ میں محلے والوں کو کیا جواب دوں گا، لیکن آپ فکر نہ کریں۔ اب میں نے بہت غور وفکر کے بعد اپنی تھوڑی سی زمین آپ کو بیچنے کا ارادہ کیا ہے۔ میں بھی مسلمان ہوں، میری ہمدردی آپ کے ساتھ ہے۔''

حاجی ثناءاللہ کی یہ باتیں سن کر فیض کو کچھ حد تک راحت نصیب ہوئی اور اس نے بلاچوں چرا فوراً ہی زمین خریدنے کی ہامی بھرلی۔ حاجی ثناءاللہ نے مزید کہا:

''دیکھو فیض بیٹے مسجد کے پیچھے جو زمین ہے، وہ میری ہے۔ کسی زمانے میں سرکاری زمین ہوا کرتی تھی، لیکن میں نے کافی تگ ودو کے بعد اس پر اپنا قبضہ قائم کیا۔ اسی میں سے تھوڑی سی زمین بیچ رہا ہوں۔ آپ تین لاکھ روپے کا بندوبست کریں اور میت کی تدفین میں دیری نہ کریں کیونکہ تدفین میں دیر کرنا گناہ عظیم ہے۔''

فیض نے بوجھل دل سے حاجی ثناءاللہ کی پیشکش قبول کی اور دو گواہان کی موجودگی میں تعزیت کے دن گزر جانے کے بعد تین لاکھ روپیہ ادا کرنے کا اقرار کرلیا۔

حاجی صاحب نے مسجد میں لاؤڈ سپیکر پر رحیم خان کی نماز جنازہ کے لیے محلے کے لوگوں کو مدعو کیا۔ رحیم خان کے جنازے کو کاندھا دینے والوں کی ایک بڑی تعداد نمودار ہوئی۔ مسجد کے احاطے میں حاجی ثناءاللہ کی امامت میں رحیم خان کا نماز جنازہ ادا کیا گیا اور رحیم خان کی میت کو مسجد کے پیچھے دفن کیا گیا۔

تعزیت کے دن گزر گئے۔

فیض نے اپنی زوجہ کا زیور بیچ دیا اور حاجی ثناءاللہ کے گھر جا کر گواہان کی موجودگی میں تین لاکھ روپیہ ان کے حوالے کیا اور فیض نے کچھ مدت بعد اس تھوڑی سی زمین کی حد بندی کر کے وہاں ''قبرستان برائے اہالیانِ بنجر پور'' کا بورڈ چڑھا دیا۔

❀❀❀

ڈاکٹر نسرین بانو

Section Officer, Urdu Section, Bihar Vidhan Prishad, Patna-800015 (Mob. 9835401108)

قمرن بوا

ثمینہ برتن دھونے کے لیے سنک کے پاس کھڑی ہوئی تو اس نے دیکھا کہ وِم بار کی ٹکیہ پرات کی تلی سے لگ گئی ہے۔ اتنے سارے برتن اس سے دھل نہیں پائیں گے۔

’’آنٹی صابن ختم ہو گیا۔‘‘ اس نے وِم بار کا پرات دکھاتے ہوئے قریب کھڑی مالکن سے کہا۔

’’ڈبے سے تھوڑا سرف لے آؤ اور اسی سے برتن دھولو۔ ہاں ڈبے کو کس کر کے بند کر دینا، ورنہ بچے اس میں پانی ڈال دیں گے۔‘‘

مالکن نے ثمینہ سے کہا تو وہ غسل خانے میں صابن لینے چلی گئی۔ اس نے دیکھا کہ یہاں دو ڈبے رکھے ہیں۔ تب کس ڈبے سے سرف نکالوں، یہ سوچنے میں اسے تھوڑا وقت لگا۔

ٹھیک اسی وقت کوئی اس کے پیچھے آ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے گالوں کو کس کر مسلنے لگا۔ وہ جھٹ سے سیدھی کھڑی ہو گئی، منھ گھما لیا۔ دوبارہ انگوٹھے اور انگلیوں کا دباؤ اتنا بڑھا کہ چھڑا کر بھاگ نہیں پائی۔ آنکھوں میں آنسو آ گئے، اس کی بیہودہ حرکت پر، پھر اس چھوٹے چاچو نے اپنا چہرہ داڑھی مونچھیں اس کے چہرے پر سٹا کر بوسہ لیا اور چلا گیا۔

ثمینہ کا دل چاہا کہ وہ زور زور سے روئے، لیکن مارے شرم اور درد کے زمین پر بیٹھ گئی۔ اسے بہت برا لگا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ کیا کروں؟ تبھی مالکن نے آواز لگائی:

’’ثمینہ ادھر آؤ! یہ چائے دادی اماں کو دے آؤ۔‘‘

وہ چائے لے کر آگے بڑھی اور بڑھتی ہی گئی۔ دادی اماں چائے کا پیالہ اپنے سامنے سے جاتے ہوئے دیکھتی رہیں...... کب تک دیکھتی رہتیں۔ آخر کار بول پڑیں:

’’ہوش میں تو ہے نہ ثمینہ۔ میری چائے کا پیالہ کہاں لیے جا رہی ہے؟‘‘ ان کی آواز پر وہ گھومی۔ چائے کا پیالہ تھمایا اور آگے بڑھ گئی۔ آنکھوں میں بھر آئے آنسو کو پینے کی کوشش میں گلا بھر آیا۔

’’ثمینہ جلدی سے دودھ کی دیگچی صاف کر دو، دودھ والا آتا ہی ہوگا۔‘‘ آنٹی کی آواز پر وہ برتن صاف کرنے باورچی خانے میں آ گئی۔ مالکن ناشتہ تیار کر رہی تھیں۔

برتن دھوتے ہوئے اسے احساس ہوا کہ اس کے گال دُکھ رہے ہیں۔ کچھ دیر بعد ادھورے برتن چھوڑ کر وہ غسل خانے میں آ گئی۔ آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا۔ گال سرخ ہو رہے تھے۔ سرخ گال پر انگوٹھے کا نشان صاف نظر آیا۔ جیسے نرم نرم گھاس پر جوتے سمیت کوئی چل دیا ہو، جس سے گھاس کی کوملتا کمبھلا گئی۔

اس نے صابن سے منھ دھویا۔ دل کے اندر تک پیوست ہو چلا غصہ دھل جائے، ایسی امید تھی، مگر آنسوؤں کی قطار مسلسل بہتی ہی رہی۔ ڈھک ڈھک آواز آئی۔ کوئی غسل خانے کا دروازہ کھلوا رہا تھا۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

دادی اماں اسے غسل خانے کے اندر جاتے ہوئے دیکھ چکی تھیں، کہنے لگیں: ’’اسے یہیں آ کر باتھ روم سوجھتا ہے۔ گھر سے فارغ ہو کر نہیں آتی۔ جانے کیوں اتنی دیر سے اندر گھسی ہوئی ہے۔‘‘

باہر نکلی تو دل چاہا کہ گھر لوٹ جائے پھر سوچا کہ ادھورے کام چھوڑ کر جائے گی تو اماں کے پاس شکایت پہنچ جائے گی، اس لیے دوبارہ اس نے کام شروع کر دیا۔ تبھی پنکی نے غسل خانے سے آواز لگائی:

’’ممی میرے صابن کو گیلا کس نے کر دیا۔‘‘

ماں نے ثمینہ کا چہرہ غور سے دیکھا جو صاف ستھرا لگ رہا تھا۔ وہ ناراض نہیں ہوئیں بلکہ مسکرا کر بولیں:

’’میں تمہیں الگ صابن خرید کر دوں گی۔ پنکی کے صابن سے منھ نہیں دھونا۔ تم اپنا صابن الگ رکھنا۔ ٹھیک ہے نا......!‘‘

ثمینہ نے گردن ہلا کر حامی بھری اور جلدی سے کام نبٹا کر اپنے گھر واپس آ گئی۔

●

آسمان کا رخ انور سورج کی کرنوں سے دمک اٹھا۔

ثمینہ کی ماں نے گھڑی نہیں دیکھی، بلکہ سورج کی کرنوں کی دمک سے وقت کا اندازہ لگا لیا۔ بولیں:

''ثمینہ۔ اسکول جانے کا وقت ہو گیا ہے۔ وہاں کونے میں گھسی کیا کر رہی ہے؟''

ثمینہ کونے میں بیٹھ کر اپنے گالوں پر پاؤڈر لگا رہی تھی۔ کریم کا ٹیوب دبا دبا کر نچوڑا، لیکن پتلی سی دوڑ بھی ٹیوب سے باہر نہیں نکلی۔ دل ہی دل میں بدبدائی۔ ساری کریم شبانہ لگا ڈالتی ہے، کسی اور کے لیے چھوڑتی ہی کہاں ہے۔

''ثمینہ اسکول جاؤ۔'' ماں نے دوبارہ اسے ٹوکا۔

''اسکول تو آج رہنے ہی دو اماں ہمارا جی اچھا نہیں ہے۔'' ثمینہ نے جواب دیا۔

ماں نے سلائی مشین سے اٹھ کر اسے دیکھا۔ اس کے ماتھے کو چھوا، گالوں کی سرخی دیکھی۔ تجربہ کار نگاہیں، سب کچھ پڑھ گئیں، پھر بیٹی سے اس کی تصدیق کی۔

''کسی نے تجھے ڈانٹا یا ستایا ہے کیا؟'' ماں نے فکر جتائی۔

اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

ماں نے اپنی زندگی اور اپنی کوکھ کو دھنیہ کر دینے والی بیٹی کو سینے سے لگایا۔ اس کے بالوں کو سہلایا، ماں کے کلیجے کا لمس پا کر اس نے اپنا چہرہ اوپر اٹھایا۔ اپنے گالوں کو دکھاتے ہوئے بولی:

''اس پنکی کے چاچو نے میرے گالوں کو اینٹھ دیا۔ اب تک دُکھ رہا ہے۔ میں اسی وقت بھاگ آتی، لیکن تم مجھے ڈانٹتیں کہ میں کام ادھورا چھوڑ کر کیوں آ گئی۔ آنٹی اور دادی ماں پورا گھر سر پر اٹھا لیتیں۔''

ماں کا دل کشمکش اور جد و جہد سے جوجھنے لگا۔ چہرہ غصے سے تمتما اٹھا۔ زندگی کی مجبوری سے وہ بے چین ہو اٹھی۔ وہ فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی کہ جا کر مالکن سے شکایت کرے یا چپ رہ جائے۔ شکایت کرنے پر کہیں وہ اسے پریشان نہ کرے۔ کہیں اس کی زندگی برباد نہ کر دے۔ طرح طرح کے مخالف خیالات اسے پریشان کرنے لگے۔

اپنی بیٹی کی پرورش کرنے میں ناکام ایک ماں کا دل غیرت سے بھر گیا۔ دل ہاہا کار کرنے لگا۔ ان سب سے ہمدردی کی امید کرنا بیکار ہے۔

چار برس کی عمر سے وہ دوسرے کے گھروں میں کام کر رہی ہے۔ ہر جگہ اسے گالوں کو سہلانے والے مرد ملے۔ سبھی اسے چمکارتے تھے، مگر آج کے جیسا درد ثمینہ کو کسی سے نہیں ملا تھا۔

اس کی میٹھی آواز اور گول مٹول گالوں نے سب کو متوجہ کیا تھا، لیکن اس خوبصورتی کی آج ایسی بے حرمتی۔

جوانی کی دہلیز پر پہنچنے کو ہوئی تو چہار سو فضا اس کی خوبصورتی سے روشن ہو اٹھی۔ آسمان زمین پیڑ پودے کلیاں سبھی اس کی خوبصورتی سے پہچانے جانے لگے۔ وہ ہنستی تو بجلی سی کوندھ جاتی۔ اس کی خوبصورتی کا ذمہ دار کون بنے گا۔ ماں کو اس بات کی فکر تھی۔

ثمینہ کی ماں نے برسوں پہلے اس کے باپ سے چھٹکارا حاصل کر لیا تھا، تبھی سے وہ چار بچوں کو پال رہی ہے۔ ساس اس کے ساتھ ہی رہتی ہیں۔ بیٹے کی حرکتوں سے وہ بھی دُکھی رہتی تھیں۔

ثمینہ تب پانچ برس کی تھی۔ اس سے بڑی ایک اور بیٹی، سب سے چھوٹا بیٹا ڈیڑھ برس کا تھا تب سے وہ اسے ساس کے پاس چھوڑ کر لاج میں کھانا پکانے جاتی تھی۔ دیر رات کو جب گھر لوٹتی تو اس کا شوہر نشے میں دھت گالیوں سے اس کا سامنا کرتا۔ ساتھ ہی بیوی کے لائے ہوئے گرما گرم کھانے پر سب سے پہلے وہی لپکتا تھا۔ دوسروں کا خیال نہیں رکھتا کہ کوئی اور بھی بھوکا ہے۔ بھر پیٹ کھا کر بھلا برا کہنے کے لیے بیٹھ جاتا۔ بیوی پر بہتان لگاتا کہ اتنی رات گئے گھر آئی ہے، جب کہ چار قدم کی دوری پر لاج ہے، لیکن اسے کہاں ہوش کہ وہ کچھ سمجھتا۔ بک جھک کر کے بستر پر دھسوڑنے کے لیے بیوی کا منتظر رہتا۔ اپنے جسم کے من مانے استعمال سے وہ گھبرا گئی تھی۔ اسے محسوس ہوا کہ اگر وہ قریب رہا تو ہر سال ایک بچہ پیدا کرنا اس کی تقدیر بن جائے گی۔

وہ اپنی کمائی کا ایک روپیہ بھی گھر میں نہیں دیتا۔ شروع کے دنوں میں ہی جب بھک مری کے حالات بن گئے تو اس نے جھاڑو برتن

کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس کے کچھ دنوں بعد لاج میں کھانا پکانے لگی۔ وہاں سے دونوں ٹائم پکا ہوا کھانا گھر بھر کے لیے مل جاتا تھا۔

بیس سے پچیس لڑکوں کا کھانا پکا کر آتی تو اس کا جسم بھی نڈھال ہو جاتا، پھر بھی وہ مطمئن تھی کہ اس کے گھر کا گزارا آسانی سے ہو رہا ہے، مگر اس گھر کا مکھیا اسے چین سے نہیں رہنے دیتا تھا۔ عاجز آ کر ایک دن اسے گھر سے بھگا دیا۔ اب اسے اپنے ہی گھر میں آنے کی اجازت نہیں تھی۔ ماں نے بھی اسے گھر آنے سے روکے رکھا۔ تب وہ اپنی بہن کے گھر رہنے لگا جو قریب میں ہی جھونپڑ پٹی بنا کر رہتی تھی۔

ثمینہ کی ماں سکون سے لاج کے لڑکوں کا کھانا پکاتی رہی۔ برسوں بیت گئے۔

ایک صبح ثمینہ کی ماں سو کر اٹھی تو کسی نے آ کر بتایا کہ اس کا شوہر گلی میں اوندھے منھ گرا پڑا ہے۔ وہ دوڑی ہوئی گھر کے باہر آئی۔ اس نے دیکھا کہ اس کا جسم اکڑ چکا ہے۔

پچھلی رات سردی زیادہ تھی۔ نشے کی حالت میں گر کر بیہوش ہو گیا۔ اٹھنے کی طاقت نہیں رہی۔ آخر کار ٹھنڈ سے ٹھٹھر کر مر گیا۔

ثمینہ کی ماں روئی نہیں۔ نہ تو اس نے شور شرابہ کیا۔ اس کے دنیا میں رہنے نہ رہنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا، لیکن اپنے معصوم بچوں پر نظر پڑی تو فکر کی ایک لکیر چہرے سے عیاں ہوگئی کہ ان بچوں کے سر سے باپ کا سایہ اٹھ گیا۔

●

ثمینہ کی ماں جب بیاہ کر اس گھر میں آئی تو اس کے شوہر نے اس کی گود میں ڈیڑھ برس کا بچہ ڈال دیا تھا، جو اس کی پہلی بیوی سے تھا۔ بیاہ ہوتے ہی وہ ماں بن گئی تھی۔ بہت تاکید سے چوکس ہو کر وہ اس بچے کی پرورش کرنے لگی۔ ڈرتی تھی کہ سوتیلی ماں بدنام نہ ہو جائے۔ اس بات کی اسے فکر نہیں تھی کہ اس کی اپنی گود بھی ہری ہو۔ نہ تو اسے انتظار تھا اور نہ چاہت۔ وہ اپنی ساری ممتا اس بچے پر نچھاور کر رہی تھی۔

ایک دن اس کی اپنی ماں نے سچیت کیا کہ وہ اپنی ممتا کا دامن سمیٹ لے۔ اپنی کوکھ ہری ہو، اس بارے میں سوچ، ورنہ زندگی بھر سوتیلی ماں بنی رہ جائے گی۔

تب شادی کے تیسرے برس سے ہر سال ایک بچہ پیدا ہونے لگا۔ تین بچے اس کی کوکھ سے پیدا ہوئے۔ سب سے بڑی شبانہ، پھر ثمینہ اور سونو۔ ان سب سے بڑا سوتیلا بیٹا ببّن۔

شبانہ کبھی کسی کے گھر جھاڑو برتن کرنے نہیں گئی۔ اسے بس چھوٹے بھائی بہن کی دیکھ بھال اور چولہا برتن اپنے گھر کا کرنے کو رکھے رہی۔ بڑے بیٹے کو بھی ہوٹل میں برتن دھونے کبھی نہیں بھیجا۔ اسے اسکول بھیجا تاکہ لڑکا کچھ پڑھ لکھ جائے گا تو صاف ستھرا کام کرے گا۔ اس کی کمائی سے پیسہ جمع کر کے بیٹیوں کا بیاہ کرے گی۔

آج کے حادثے نے اسے گزرے دنوں کی یاد دلا دی۔

''اماں مجھے کام پر مت بھیجا کرو۔ میں صرف پڑھنے جاؤں گی۔ جیسے تم ببّن بھیّا، سونو اور آپی کو بھیجتی ہو۔ ویسے ہی مجھے بھی بھیجا کرو۔'' ثمینہ نے ماں سے خصوصی التجا کی۔

ماں نے اسے سینے سے لگا لیا:

''بیٹی میں چاہتی تو ہوں، مگر ہو نہیں پاتا۔ تم پیسے لاتی ہو تو اس سے گھر چلانے میں مدد ملتی ہے۔ شبانہ استانی سے اردو عربی پڑھتی ہے تو اس کا بھی پچاس روپیہ دینا پڑتا ہے۔ اگر نہیں پڑھے گی تو اس کا بیاہ نہیں ہو پائے گا۔ جب بڑا بھیا کام کرنے لگے گا۔ تب تجھے گھر بیٹھا لوں گی۔ اپنی بے بس ماں کی خاطر کچھ دن اور تکلیف برداشت کر لے۔''

''مگر میں اس گھر میں نہیں جاؤں گی۔ مجھے کہیں اور بھیج دو، مگر وہاں نہیں۔ پنکی کے چاچو سے مجھے بہت ڈر لگتا ہے۔''

''ٹھیک ہے بیٹا۔ میں کہیں اور بات کرتی ہوں، پنکی کے گھر سے کوئی بلانے آئے گا تو کہہ دوں گی کہ تو بیمار ہے۔ میں سمجھا کر کام سے منع کر دوں گی۔'' ماں نے اسے تسلی دی۔

بارہ برس کی ثمینہ کو کون سا کام ملتا۔ کسی دوسرے کے گھر بھیجنے کی ہمت اب اس میں نہیں تھی۔ بہت غور و فکر کے بعد وہ اسے اپنے ساتھ لاج لے جانے لگی۔ جہاں بھیا لوگوں کے کپڑے دھونے کا کام اسے کرنے کو ملا۔ ماں کھانا پکاتی اور بیٹی کپڑے دھوتی۔ اس طرح دونوں ایک دوسرے کے کام میں بھی ہاتھ بٹاتیں۔ سب کچھ معمول پر تھا۔ روزمرہ آسانی سے گزرنے لگا، دونوں خوش تھیں۔

اس مرتبہ بڑا بیٹا میٹرک امتحان میں بیٹھے گا۔ ماں اس سوتیلے پر واری جارہی تھی۔ اس کے لیے ہارلکس خرید کر لائی۔ اسے دودھ میں ملا کر دیا تاکہ وہ پڑھائی ٹھیک سے کرے۔ دوسرے بچوں نے بھی ہارلکس پاؤڈر کو ہتھیلی پر رکھ کر چکھا۔ اگر وہ اچھے نمبروں سے میٹرک پاس کر لیتا ہے تو اسے کسی کام میں لگا دوں گی۔

شبانہ ماں کی لمبائی پار کر چکی ہے۔ برس دو برس میں اس کا بیاہ کر دینا ہوگا۔ ماں نے سب کچھ سوچ رکھا ہے، کب کیا اور کیسے کرنا ہے۔ بس پیسوں کی خاطر ہاتھ بندھے تھے۔ اوپر والے پر بھروسہ تھا کہ وہ لڑکی کی قسمت سے بہتر انتظام کرے گا۔

بیٹے نے جب میٹرک کر لیا تو پہلا کام اسے ہاکر کا ملا، وہ بھور میں اٹھ کر نیوز پیپر بانٹنے جاتا، دس بجے تک واپس لوٹتا۔ اس کے بعد برتن کی دکان پر دن کے گیارہ بجے سے سیلس مین کی حیثیت سے کام کرنے لگا۔

مارکٹ میں رہتے ہوئے وہ کافی تیز اور سمجھ دار ہوگیا۔ ماں کی آنکھوں کی روشنی بڑھ گئی۔ اس کی پرورش کامیاب ہوگئی۔

قمرن بوا نے ایک برس تک روپیہ جمع کیا۔ دوسرا برس بھی شروع ہوگیا۔ اس عید تک بیٹی کو بیاہ دینا ہے۔ ایک لڑکا بھی نظر میں آگیا ہے۔ ٹیمپو ڈرائیور ہے۔ ایک چھوٹا سا اپنا مکان ہے۔ بیس ہزار نقد اور گرہستی کا سامان کی ڈیمانڈ کے ساتھ رشتہ کی اسے درکار تھی۔

یہ رشتہ قمرن بوا کو مناسب لگا، اس لیے رشتہ طے ہوگیا۔

لاج کے لڑکوں سے بھی مدد کی التجا کر دی تھی۔ قمرن بوا سے سب نے وعدہ کیا کہ وہ ضرور مدد کریں گے۔ قمرن بوا نے ہاتھ اٹھا کر دعا مانگی کہ ان لڑکوں کے دل میں غریب کے لیے اللہ ہمدردی ڈال دے۔

●

رمضان شروع ہوگیا ــــــ

محلے ٹولے میں دائی بوا تلاش کی جانے لگی، جن کے گھر میں پہلے سے بوا ہے وہ ایک اور چاہتی ہیں رمضان کے لیے۔ جن کے گھر نہیں ہے وہ رمضان بھر کے لیے بوا رکھنا چاہتی ہیں۔ ایک دن نعیم صاحب کی بیگم قمرن بوا کے پاس آئیں اور کہنے لگیں:

''میری بیٹی دہلی میں بیاہی ہے۔ اسے بچی پیدا ہوئی ہے۔ ایک ماہ کے لیے ثمینہ کو اس کے پاس بھیج دو۔ اس کا بیٹا ایک برس کا ہے اس کی دیکھ بھال کے لیے۔ اسے میں ساتھ لے جاؤں گی اور واپس بھی ساتھ لے آؤں گی۔ رمضان شریف میں کام بھی بڑھ جاتا ہے۔ میں بھی اپنا چھوٹا بڑا کام اس سے کراؤں گی۔ صرف ایک مہینہ۔ عید کر کے واپس آجاؤں گی۔ میرا کام چلا دو۔ تمہارا یہ مجھ پر احسان ہوگا۔''

قمرن بوا کچھ نہیں بولیں۔ چپ چاپ سنتی رہیں۔

''میں کل پھر آؤں گی، سوچ کر بتانا۔''

ماں کچھ فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی کہ تبھی ثمینہ خوشی سے بول پڑی:

''میں دلی جاؤں گی۔ مجھے دلی بھیج دو اماں۔''

''اتنی دور میں تجھے کیسے بھیج دوں۔''

''مجھے دلی گھومنا ہے۔ ایسے تو میں کبھی نہیں جا پاؤں گی۔ میری اچھی اماں۔ مجھے جانے دو۔''

دوسرے دن نعیم صاحب کی بیگم پھر سے آدھمکیں۔ دس ہزار کے نوٹوں کی گڈی تھما کر بولیں:

''اسے رکھ لو۔ بیٹی کے بیاہ میں کام آئے گا۔''

پاس میں کھڑی ثمینہ مسکرا رہی تھی۔ انتظار کر رہی تھی کہ اماں ہاں بول دیں تاکہ وہ اپنی سہیلیوں کو جا کر بتا آئے کہ وہ دلی جارہی ہے دلی......

بیٹی کو خوش دیکھ کر ماں کا دل ہلکا ہوگیا۔ دوسری طرف یہ دس ہزار جسے اکٹھا کرنے میں کافی وقت لگ جاتا، پھر ایک مہینے کی تو بات ہے۔ ماں نے اپنے دل کو سمجھاتے ہوئے حامی بھر دی۔

لاج کے لڑکوں نے رمضان شریف کی آمد کے بعد سے روپیہ دینا شروع کر دیا۔ ساتھ میں اناج، دالیں تیل وغیرہ بھی خرید کر پہنچایا۔ قمرن بوا خوشی سے کھل اٹھیں۔

پورے رمضان وہ چیزوں کی خریداری میں لگی رہیں۔

●

عید گزر گئی ــــــ

اب ثمینہ کی آمد میں قمرن بوا پلکیں بچھا کر بیٹھ گئیں۔ وہ آجائے تو گھر کے کاموں میں کافی مدد ملے گی۔ شادی کا گھر ہے۔ تاریخ رکھی جا چکی ہے، عید کے آخر میں۔ قمرن بوا نعیم صاحب کے گھر گئیں اور پوچھا:

''بیگم صاحبہ بٹیا کو لے کر کب آئیں گی۔''

''میں پوچھ کر بتاؤں گا''، انہوں نے مختصر سا جواب دیا۔

ایک ہفتہ تک وہ چپ لگائے رہی۔

اس کے بعد دوسری اور تیسری مرتبہ گئی تو بیگم صاحبہ اسے ملیں۔ وہ واپس آ گئی تھیں، مگر ثمینہ کو وہیں چھوڑ آئی تھیں۔ قمرن بوا بگڑ گئیں۔

''آپ نے ایسا کیوں کیا۔ اسے لے کر نہیں آئیں چھوٹی بہن کے بغیر اس کی شادی کیسے کردوں۔ آپ نے وعدہ کیا تھا۔ اس کا رہنا بہت ضروری ہے۔ آپ کسی سے بلوا دیجئے۔''

''وہ نہیں آئے گی۔ بقرعید بعد جب بیٹی میری آئے گی تب اس کے ساتھ واپس آئے گی۔''، بیگم صاحبہ نے جواب دیا۔

''نہیں آپ ایسا نہیں کریں گی۔ اپنے داماد سے کہئے کہ وہ لاکر پہنچائے۔ میں اس کے بغیر شادی نہیں کرسکتی۔'' قمرن بوا رو پڑیں۔

''چپ چاپ اٹھو اور یہاں سے چلی جاؤ۔ ورنہ......''

بیگم صاحبہ نے تیور بدلے۔

آنکھوں میں آنسو لئے وہ واپس لوٹ آئی۔ جیسے تیسے بھاری من سے بیاہ کی تیاری میں لگ گئی۔ دل کے اندر کا سونا پن اسے پریشان رکھتا، لیکن بیٹی بیاہنا ضروری ہے۔ وہ بیگم صاحبہ سے روپیہ لے چکی ہے۔ کہیں ضد کرنے پر اسے واپس نہ کرنا پڑ جائے۔ میں نے ان سے روپیہ مانگا نہیں تھا انہوں نے خود سے دیا تھا۔ بدلے میں ہماری بچی کو لے گئیں۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔ اپنی بے بسی پر۔

''اماں تم فون پر ثمینہ سے بات کرلو۔ تمہارے دل کو تسلی ہوجائے گی۔'' بیٹے نے ماں کو سمجھایا۔ بہت مشکل سے نعیم صاحب کی بیگم فون پر بات کرانے کو راضی ہوئیں۔

''اماں مجھے بلالو۔ میرا دل یہاں نہیں لگ رہا ہے۔ مجھے بہن کی شادی دیکھنا ہے۔''

ماں سمجھ گئی کہ یہاں باہر بھیتر گھومتی تھی۔ وہاں فلیٹ کی زندگی ہے۔ اس میں قید ہوکر رہ گئی ہوگی۔

ماں نے کسی طرح دکھتے دل سے بیٹی کو بیاہ دیا۔

کسی طرح تین ماہ گزرے اور ثمینہ واپس لوٹ کر آ گئی۔

آتے ہی اس نے پہلا کام یہ کیا کہ اماں سے پکا وعدہ لیا کہ اب تم مجھے واپس مت بھیجنا۔

پندرہ سے بیس دن گزرے ہوں گے کہ ثمینہ کو واپس لے جانے کا اصرار بیگم صاحبہ پھر سے کرنے لگیں۔ ماں نے صاف کہہ دیا کہ:

''اگر بچی جانا نہیں چاہتی تو میں کیا کروں؟ وہاں پر اس سے دن بھر کام لیا جاتا تھا۔ ذرا سی چوک ہونے پر ڈانٹ اور مار بھی پڑنے لگی تھی۔ بچی ڈر گئی ہے، پھر آپ نے تو صرف ایک مہینہ کا کہا تھا۔ پھر اب کیوں؟ وہ غصہ سے بھر گئی۔ بچی کی جان پر بن آئی ہے اور آپ کہتی ہیں کہ پھر لے جائیں گے۔''

پہلی مرتبہ قمرن بوا نے بیگم صاحبہ کے سامنے اپنے تیور بدلے:

''نہیں جاسکتی ہے تو میرے دس ہزار روپیہ واپس کردو۔''

بیگم صاحبہ نے بھی اپنا رخ بدلتے ہوئے کہا:

''روپے تو خرچ ہوگئے۔'' قمرن بوا نے لاچاری جتائی۔

''خرچ ہوگئے تو بیٹی کو بھیج کر چکاؤ......میں کچھ نہیں سننا چاہتی۔''

بیگم صاحبہ حکم دے کر چلی گئیں۔

ماں کو اس مشکل کا حل نہیں سوجھ رہا تھا۔ وہ بیٹی کو پکڑے یوں بیٹھی رہی کہ جیسے کوئی اسے ان سے چھین کر نہ لے جائے۔ سانجھ نے چپکے سے اپنا آنچل سمیٹ لیا اور رات نے بڑھ کر اپنا دامن پھیلا دیا۔

دونو جوان قمرن بوا کے دروازے پر آ کر کھڑے تھے۔ بوا نے دیکھا کہ وہ لاج کے لڑکے ہیں، جو انہیں بلانے آئے ہیں۔

''کیا بات ہے بوا۔ آج آپ اب تک نہیں آئیں۔ ہم سب کو کھانا کیسے ملے گا''، ایک لڑکے نے بوا سے کہا۔

دل کا درد آنکھوں میں اتر آیا۔ ساری باتیں انہیں بتا کر بوا نے اپنا آنچل ان دونوں کے سامنے پھیلا دیا۔

''ہماری بیٹی کو ان سے بچا لیجئے صاحب میں زندگی بھر آپ کے جوٹھے برتن دھوؤنگی۔''

''یہ سب کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ ہمارے ساتھ چلئے۔ ہم سب مل کر سوچتے ہیں کہ کیا کرنا چاہئے۔''

(بقیہ ص ۴۶ پر)

عطا اللہ احمد
Moh. Faizullah Khan "Hamid Colony" Darbhnga - 846004 (Mob.8757358485)

دل بھی کتنا باغی ہے!

چاروں طرف کہرے کی حکمرانی تھی۔ بلب تو کئی جل رہے تھے ،لیکن اس کی روشنی بھی کہاسے کے سامنے دور تک ٹک نہیں پا رہی تھی۔ ہر شخص کہیں نہ کہیں دُبکا تھا۔بس انجن اورٹرین پر سوار ہوتے اور اترتے لوگوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ البتہ کچھ کچھ وقفے سے ہو رہے اناؤنسمنٹ مجھے اسٹیشن پر ہونے کا احساس دلا رہے تھے۔

’’......یاتری کرپیا دھیان دیں......گاڑی نمبر ۷۷ ۵۵
جوسہرسا سے چل کر در بھنگہ، حاجی پور، پریاگ راج کے
راستے دہلی جائے گی، پلیٹ فارم نمبر چار پر کھڑی ہے۔‘‘

کچھ دیر بعد پھروہی آواز گاڑی نمبر اور جگہوں کا نام بدل کر سنائی دیتی اور بے چین کر جاتی۔ پچھلے کئی گھنٹوں سے میں سیتاپور جنکشن کے پلیٹ فارم تین پر ایک کنارے اور برج کی اوٹ میں اُسی بینچ پر اپنے اکلوتے بیگ کا سہارا لے کر بیٹھی ہوں۔سنیل کے انتظار میں میری نگاہ بار بار مین گیٹ کی جانب اٹھ جاتی ہے جہاں کہرے کی وجہ سے مسافر صاف صاف دکھائی نہیں دے رہے ہیں۔انتظار کی گھڑی لمبی ہوتی ہے،سنا تھا، مگر آج محسوس کر رہی تھی۔

مجھے گھر سے نکلے چار گھنٹے سے زیادہ ہو چکے تھے۔سنیل کا فون بھی اب’’ناٹ ریچیبل ‘‘ آرہا تھا۔بے چینی سے میرا برا حال ہو رہا تھا اور کئی طرح کے اوٹ پٹانگ غلط سلط خیالات ذہن میں آرہے تھے۔اب تو اس فیصلے پر مجھے پچھتاوا ہونے لگا تھا۔سنیل کے ساتھ بیتے وہ سارے پل یاد آرہے تھے۔اس نے مجھے دھوکا دیا کیا؟...... پر وہ ایسا نہیں کر سکتا...... پھر وہ آیا کیوں نہیں؟ نہ جانے ایسے کتنے سوالات میرے من میں پیدا ہو رہے تھے۔اب میری ہمت ٹوٹ رہی تھی اور آنکھ سے آنسو بہنے لگے تھے۔

ایک ہفتے پہلے سنیل نے مجھ سے کہا تھا کہ ہم شادی کر لیتے ہیں، پر میں اس سے شادی کی بات اپنے گھر والوں سے نہیں کر سکتی تھی، کیوں کہ وہ ایک غریب گھر کا بڑا لڑکا ہے اوراس کے سر پر پورے گھر کی ذمہ داری ہے، میں دو بہنوں میں سب سے چھوٹی گھر کی جان، پتا جی کا غرور...... وہ میری شادی کبھی بھی اُس سے نہیں کر سکتے۔ہم دونوں کے درمیاں کئی دیواریں حائل تھیں۔سنیل اپنی ضرورت پوری کرنے کے لئے کالج کے بعد ہوٹل میں کام بھی کرتا تھااورکون سا سنیل کے گھر والے بھی اس سے میری شادی کرنا چاہیں گے۔ میں چھوٹی ذات کی اور وہ برہمن ۔ ہماری محبت کا انجام...... میں سوچ سوچ کر پریشان تھی۔بس ایک ہی راستہ تھااور ہم دونوں مناسب وقت کی تلاش میں تھے۔

صحیح کہا جاتا ہے جب ہم پورے دل سے کچھ چاہتے ہیں تو راستہ بھی نکل آتا ہے۔سنیل نے خوشخبری سنائی کہ اسے دہلی میں ایک جاب ملی ہے۔میں نے فوراً ہی کہا تھا:

’’میں بھی چلتی ہوں اور وہیں شادی کرلیں گے۔‘‘

ہم دونوں نے پروگرام طے کرلیا۔

میں اپنے گھر پہ اس بارے میں اپنی بہن کو بتانا چاہتی تھی، لیکن مجھے ڈر تھا وہ کہیں پتا جی کو بول نہ دے، اس لئے خاموش رہی اور تیاری میں جٹ گئی۔ پتا جی کا خوف تھایاان کی عزت کہ آج تک ان سے اپنے کسی بھی دوست کے بارے میں بات نہیں کر سکی تھی۔دن کالج میں گزرتا، کس کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا ہے کبھی کسی نے بھی پوچھا نہیں، اتنا بھروسہ رکھتے ہیں میرے گھر والے۔ البتہ میری ایک دوست نازیہ کو جانتے ہیں، اس کا فون آتا رہتا تھا۔ مجھے خوشی تو اس بات کی تھی کہ سنیل کے بارے میں ان کو بھنک تک نہیں تھی۔

سنیل میرے کالج کا دوست تھا ۔ وہ ہوٹل مینجمنٹ کا اسٹوڈنٹ اور میں فیشن ڈیزائن کا کورس کر رہی تھی۔ ایک اچانک

ملاقات اوراس کی شرافت نے میرا دل جیت لیا تھا۔ وہ تھا بھی ذہین اور محنتی۔ ایک ہی سال میں وہ اتنا قریب آ گیا کہ میں اس کے لئے گھر سے ٹفن لے آتی اور ہم اکثر ساتھ ہی لنچ کرتے۔ اس کے لئے مجھے اپنے گھر پر جھوٹ بولنا پڑتا۔ شروع شروع میں تو مجھے بہت جھجک ہوتی، پھر دھیرے دھیرے بہانے بنانے میں ماہر ہوگئی۔ اس میں بڑا مزہ آتا اور ایک طرح کی خوشی محسوس ہوتی، لیکن ہماری محبت سے اب کالج کے دیوارودَر بھی واقف ہو چکے تھے اور میں آنکھیں موندے خوابوں میں سنیل کے ساتھ ہوا کے دوش پے اڑتی چلی جاتی۔ خیالوں میں گم پتہ نہیں کب نیند کی آغوش میں چلی گئی۔

میری آنکھ کھلی تو ہڑ بڑا کر موبائل میں وقت دیکھا، صبح کے تین بج رہے تھے۔ گھر سے نکلے مجھے آٹھ گھنٹے سے زیادہ ہو چکے تھے اور اسٹیشن آئے بھی چھ گھنٹے۔ میرا شال بھی کہاسے کی وجہ سے سرد ہو رہا تھا اور میں بھی سردی کی وجہ سے کپکپا رہی تھی۔ میں نے پھر سنیل کو کال کیا فون اب بھی ''ناٹ ریچبل'' آ رہا تھا۔

میں سوچنے لگی، اب تک اس خط سے جو میں گھر پر چھوڑ آئی تھی، سب نے جان لیا ہوگا۔ اس میں گھر چھوڑ کر جانے کی بات تھی، مگر میں نے سنیل کا نام نہیں لیا تھا۔ پتا نہیں کیا کیا ہوا ہوگا۔ پتا جی پر کیا بیتی ہوگی اگر پڑوسیوں کو جانکاری ملی ہوگی تو کتنی فضیحت اٹھانی پڑی ہوگی گھر والوں کو، کہاں کہاں ڈھونڈا ہوگا، پتا جی ڈائویٹک ہیں ان پر کیا اثر ہوا ہوگا...... میں پریشان ہونے لگی...... یہ سب پہلے کیوں نہیں سوچا۔ سنیل کو کوستے ہوئے میرے ذہن میں اب ایک ہی سوال تھا کہ اب کہاں جاؤں۔ یہ خیال مجھے رُلا رہا تھا۔ بس ایک ہی سہیلی نازیہ ہے جس کے پاس میرا یہ نیا نمبر ہے۔ میں نے اسے کال لگایا اس نے ریسیو نہیں کیا۔ کچھ دیر بعد ایک نئے نمبر سے میرا فون بجا، میں نے فون اٹھایا۔

''ہیلو......''

یہ آواز نازیہ کی تھی۔ اس نے پوچھا: ''کہاں پہنچی؟''

''اس نے میری زندگی برباد کردی...... سنیل نہیں آیا۔''

''پر...... وہ...... پھر تم رات بھر کہاں رہی ہو؟''

''سیتاپور اسٹیشن پر اس کے انتظار میں۔''

''تم نے اس کو کال کیا تھا؟''

''اب موبائل بھی آف کر دیا اس نے۔ اب وہ نہیں آئے گا نازیہ۔ اب میں کہاں جاؤں، اس نے تو کہیں کا نہیں چھوڑا۔''

میری آواز روندھ گئی۔

کچھ دیر خاموشی کے بعد میں نے موبائل کان سے لگایا:

''بیٹی گھر واپس آجاؤ''

یہ آواز میری ماں کی تھی۔ ان کی آواز نے جیسے مجھ کو مضمحل کر دیا۔ سنیل نے مجھے کسی کو منھ دکھانے لائق بھی نہیں چھوڑا۔

''تم کہاں ہو بیٹی؟'' میرا گلا بندھ گیا تھا آواز کہاں سے نکلتی، ابھی تو بس چند سسکیاں تھیں جو حال زار بیان کر رہی تھیں۔

کچھ دیر بعد میں پتا جی کو آتا دیکھ کر زمین تکنے لگی۔ انہیں دیکھ کر جینے کی تمنا جاگ گئی تھی۔ انہوں نے مجھے سینے سے لگالیا۔ میں پھوٹ پھوٹ کر روئے جارہی اور وہ خاموش تھے۔ کچھ دیر تک میں روتی رہی پھر پتا جی کی شفقت اور باہوں کے گھیرے میں تمام بیٹیوں کی طرح خود کو دنیا کی سب سے خوش نصیب بیٹی تصور کرنے لگی۔ سسکیوں کے درمیان میری آواز نکلی:

''مجھے معاف کر دیجئے...... مجھ سے غلطی ہوگئی ہے۔''

گھر واپس آنے کے بعد میں نا ہی کبھی کالج گئی، نا ہی سنیل کے بارے میں کچھ پتا کیا۔ اب میں گھر کے کام میں مصروف ہوگئی تھی۔ ایک سال بعد پتا جی نے ایک تصویر دکھاتے ہوئے پوچھا:

''یہ ہیرا سافی ہے، بزنس مین ہے اپنے پشتینی کاروبار سنبھال رہا ہے۔ ایم بی اے بھی ہے۔ تم ایک بار مل کر دیکھ سکتی ہو؟''

''آپ نے دیکھ لیا تو ٹھیک ہی ہوگا۔''

انہوں نے کئی بار مجھ سے پوچھا:

''تم اگر کہو تو کوئی اور لڑکا دیکھتے ہیں...... یا تم کو کوئی پسند ہے تو بتاؤ......؟''

اس طرح کے سوالات مجھے میری غلطی یاد دلا دیتے۔ ماضی کا درد ساتھ نہیں چھوڑتا۔ شادی کے دن میرے سارے دوست آئے ہوئے تھے۔ شادی کی دعوت سب کو دی تھی۔ اب مجھے سنیل سے کوئی

شکایت نہیں تھی۔ اس کے گھر بھی کارڈ بھیجوا دیا تھا۔ سب لوگ دِکھ رہے تھے، سنیل نہیں دکھا۔ اب اس کے بارے میں جاننا کوئی ضروری تو نہیں تھا، لیکن دل بغاوت پہ اتر آیا...... میں نے پوچھ ہی لیا:

''کون کون نہیں آسکا ہے؟''

سب نے کئی نام لئے پر سنیل کا نام کسی نے نہیں لیا۔

''وہ سنیل کہاں ہے آج کل......؟''

تھوڑی جھجھک کے ساتھ میں نے پوچھا۔ کسی نے بتایا:

''وہ تو مر گیا ایک ایکسیڈنٹ میں...... ایک سال پہلے......''

ایک پل کو میں نے سوچا سہی ہی ہوا اس دھوکے باز کے ساتھ، لیکن دل کی بے کلی تھم نہیں رہی تھی۔ پھر کسی نے افسوس کرتے ہوئے پوچھا:

''کیسے ہوا یہ......؟''

''وہ ایک سال پہلے کی بات ہے...... اتنا جانتے ہیں کہ وہ رات کو نئی جاب جوائن کرنے دہلی جانے کو گھر سے نکلا تھا...... کہرے سے گھری رات تھی...... قسمت کا لکھا، بس تھوڑی دور رکشہ سمیت ٹرک کی زد میں آ گیا۔''

اب میری رگوں میں دوڑتے خون کے جم جانے کی باری تھی۔ اس رات کا سارا منظر صاف تھا۔ اپنی محبت میں اتنی اندھی ہوسکتی ہوں، سوچا بھی نہیں تھا۔ میں اپنی سوچ پر رونا چاہتی تھی پھوٹ پھوٹ کر، مگر اب یہ بھی ممکن کہاں......! ❁❁

قمرن بوا (ص ۴۳ سے آگے)

بوا اپنی بیٹی کو ساتھ لے کر لاج آ گئیں۔ وہاں کھانا پکایا اور واپس اپنے گھر آ گئیں۔

دوسرے دن لاج کے لڑکوں نے قمرن بوا کے ہاتھ میں دس ہزار روپے دے کر کہا:

''اسے آپ نعیم صاحب کی بیگم کو دیجیے گا تاکہ آپ کا قرض اتر جائے، لیکن وہاں آپ اکیلے نہیں جائیں گی ہم سب ساتھ چلیں گے۔''

نعیم صاحب اپنے دروازے پر اتنے سارے لڑکوں کو دیکھ کر گھبرا گئے۔ ساتھ میں ثمینہ اور اس کی ماں کو دیکھ کر سمجھتے دیر نہیں لگی کہ معاملہ کیا ہے۔ آہٹ سن کر نعیم صاحب کی بیگم بھی دروازے پر آ گئیں۔

''ہاں قمرن بوا انہیں دس ہزار واپس دیجیے اور اپنا قرض چکائیے تاکہ آپ کی بیٹی ان سے آزاد ہو سکے۔'' قمرن بوا نے روپیہ بیگم صاحبہ کی جانب بڑھایا تو وہ جھٹ سے پیچھے ہٹ گئیں۔

''میں نے اسے کوئی روپیہ قرض نہیں دیا۔ میں نے تو اس کی مدد کی تھی۔'' بیگم صاحبہ پریشان ہو گئیں۔

''تب انہیں تنگ کیوں کر رہی ہیں۔ ان کی بچی کو زبردستی دلی لے جانے کو کیوں کہہ رہی ہیں۔'' ایک لڑکے نے ان سے یہ بات کہی۔

''نہیں نہیں میں تو اس کے بھلے کے لیے کہہ رہی تھی۔''

بیگم صاحبہ ہڑبڑا رہی تھیں۔

''بس یونہی انہوں نے کہہ دیا ہوگا۔''

بیوی کو پریشان دیکھ کر نعیم صاحب بول پڑے۔

''تب کیا کہہ رہی ہیں بیگم صاحبہ؟''

ایک دوسرے لڑکے نے پھر سے پوچھا۔

''یہ نہیں چاہتی تو نہیں بھیجوں گی...... جانے کے لیے نہیں کہوں گی اور کیا......''

''آج سے آپ قمرن بوا کو پریشان نہیں کریں گی۔ ان سے کوئی کام ہو تو اس سے پہلے ہم سے بات کریئے گا۔ کیونکہ ثمینہ اب ہم سب کی ذمہ داری ہے۔ اب یہ کہیں بھی کام نہیں کرے گی۔ صرف اسکول جائے گی۔''

اس نوجوان کی بات سن کر سب خاموش رہے۔ صرف نعیم صاحب نے حامی میں سر ہلایا اور وہ دس ہزار روپیہ، جو ان لڑکوں نے مل کر اکٹھا کیا تھا۔ آپس میں بانٹ لیا۔ ❁❁

خصوصی توجہ طلب

اکادمی مجلّہ ماہنامہ ''زبان وادب'' کے بارے میں ساری معلومات کے لئے انچارج جناب محمد شاہد سے ان کے موبائیل 9897958115 پر نیز مسودات اور کتابوں پر انعامات کے سلسلے میں انچارج جناب محمد تمنا سے ان کے موبائیل 9931606459 پر رابطہ کریں۔ شکریہ! (ادارہ)

گاہے گاہے......

عزیز مرزا*

گرمی کا سماں

اردو شاعری میں یہ بہت بڑی خرابی ہے کہ مقامی رنگ جس کو انگریزی میں لوکل کلر (Local Clerk) کہتے ہیں، بالکل نہیں ہے۔ اس کی وجہ جہاں تک غور کیا جاتا ہے، یہی ہے کہ اردو شاعری کا نشو ونما اُس زمانے میں ہوا جب کہ اہل ہند تقلید کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے اور جدت خیال کا نام کفر تھا، اس لئے وہ اپنی آنکھوں، اپنے جذبات اور اپنے خیالات سے تو کام نہیں لے سکتے تھے، ان کو خواہ مخواہ دوسری طرف توجہ کرنی پڑی اور چونکہ فارسی شاعری اسلامی حکومت اور ایرانی تمدن کی بدولت پہلے ہی سے ہند میں اپنا سکہ بٹھا چکی تھی، اس لئے لازمی طور پر وہی سب کی منظور نظر ٹھہری اور اُسی کو امامت اور اُستادی کا درجہ دیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے شاعر سرزمین ہند میں ایران کے خواب دیکھتے ہیں اور وہیں کے طرز کلام، وہیں کے پھولوں، وہیں کے پھلوں اور وہیں کے پرندوں سے اپنے خیالات کے باغ آراستہ کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ فارسی کی طرح اردو میں بھی مردموضوع شاعری قرار پائے اور وہی تشبیہیں اور استعارے مروج ہوئے جو اہل ایران کے کلام کی گرمی کا موجب ہیں۔

اگرچہ اس وجہ سے کہ جذبات انسانی ہر جگہ ایک ہی ہیں یہاں طباعی باوجود اتنی قیود کے درجہ کمال پر پہنچ کر ہی رہی، لیکن کاملین کے کلام کو بھی وہ بات اور وہ اثر نصیب نہ ہوا جو مقامی رنگ کا حصہ ہے اور جن لوگوں کو منبع فیض سے اتنا حصہ نہ ملا تھا، اُن کا کلام تو فارسی شاعری کی پھیکی اور بھدی نقل بن کر رہ گیا۔ ہمارا تمام لٹریچر گل وبلبل کی داستان سے بھرا پڑا ہے، حالانکہ ہندوستان میں کبھی کسی نے بلبل کی شکل بھی نہیں دیکھی اور کنول کے پھول اور کوئل کی کوک اور بھونرے کی بے قراری کا، جو ہندستان کی خصوصیات اور ہر وقت ہمارے پیش نظر ہیں، کہیں نام بھی نہیں ہے۔ قیس وفرہاد کے دل خراش قصے تو بچے بچے کی زبان پر ہیں، مگر نل اور پرورداس کا کوئی نام بھی نہیں جانتا۔ لیلیٰ وشیریں کے حسن خداداد کی شہرت تو عالمگیر ہے مگر درو پدی و سیتا کی ناز آفرینی وکرشمہ سازی ہمارے شاعروں کی آنکھ سے اوجھل ہے۔

کاش ہماری تقلید سے سرشار بزرگ بجائے فارسی کے یا

* مولوی محمد عزیز مرزا دہلوی ۱۸۶۵ء میں پیدا ہوئے۔ جب ۱۸۷۵ء میں سرسید نے ام۔اے۔او کالج قائم کیا تو عزیز مرزا اُن طالب علموں میں سے تھے جو پہلے پہل اس کالج میں طالب علم کی حیثیت سے داخل ہوئے۔ ۱۸۸۷ء میں آپ نے یہاں سے بی۔اے کی ڈگری حاصل کی اور اس حیثیت سے یہ ہندوستان کے پہلے مسلمان تھے جنھوں نے یہ اعزاز حاصل کیا۔ اس کے بعد حیدر آباد میں سکریٹریٹ کے محکمہ میں ملازم ہوگئے اور ۱۸۹۱ء میں اسسٹنٹ ہوم سکریٹری بنادئے گئے۔ اسی دوران میں کورٹ آف وارڈس کا انتظام بھی آپ کے سپردگی میں دیا گیا اور

اس کے معاوضہ میں تین سو روپیہ مہینہ تنخواہ مقرر ہوئی، مگر آپ نے یہ کہہ کر انکار کردیا کہ میں یتیموں کے کام کا کوئی معاوضہ نہیں لینا چاہتا۔ ۱۸۹۵ء میں آپ فرسٹ ہوم سکریٹری اور ۱۸۹۶ء میں ہوم سکریٹری ہوگئے۔ اس زمانہ میں اپنی علم پروری کی بنا پر بہت سے لوگوں کو فائدہ پہنچایا اور ان سے اچھی اچھی کتابیں لکھوائیں۔ ۱۹۰۲ء میں بیہٹر کے کلکٹر مقرر ہوئے اور وہاں سرائے، مدرسہ، کتب خانہ اور کلب وغیرہ بنوایا۔ ۱۹۰۶ء میں ہائی کورٹ کے جج مقرر ہوئے اور اس کے ایک سال بعد ۱۹۰۷ء میں پھر ہوم سکریٹری ہوگئے۔

فارسی کے ساتھ ساتھ ہی ہندی شاعری کو بھی اپنا نمونہ یا رہبر یا طریق بناتے تو باوجود تقلید کے ان کو وہ بات نصیب ہو جاتی جس کو اب آنکھیں ڈھونڈتی ہیں اور بے فائدہ ڈھونڈتی ہیں۔ ہندی شاعری کا نشو و نما اور پرورش ہندی ہی کی آب و ہوا میں ہوئی ہے، اس لئے وہ اہل ہند کے اصلی جذبات، اُن کی واقعی خصوصیات اور مقامی معلومات سے بھری ہوئی ہے۔ وہ جس چیز کو بیان کرتے ہیں اُس کی تصویر آنکھوں کے سامنے کھڑی کر دیتے ہیں۔ اُن کی انوکھی تلاش دل کو بے قرار کر دیتی ہے اور ان کے قوی جذبات دل سے نکل کر دل ہی میں بیٹھ جاتے ہیں۔ طبیعت انسانی کے مطالعہ اور فطرت کی رنگا رنگ گل کاریوں کے مشاہدے میں ان کو خاص دخل ہے۔

آج کل اس میں شک نہیں کہ ہماری شاعری کا ایک خاص رنگ پیدا ہو رہا ہے، لیکن چونکہ اس کا دارومدار بھی انگریزی شاعری کی تقلید پر ہے، اس لئے وہ ہماری شاعری کو مقامی خصوصیات سے جو دراصل ہر شاعری کی جان ہیں، اور بھی دور لئے جا رہا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اگر ابتدا میں کالی داس اور بھاؤ بھوتی وغیرہ کی نظموں کا ترجمہ اردو میں ہو گیا ہوتا تو آج اردو شاعری کا رنگ بالکل دوسرا ہی ہوتا اور گو اب انگریزی مذاق کے زور پکڑ جانے کی وجہ سے ہندی رنگ کا فروغ پانا کسی قدر دشوار ہو گیا ہے، لیکن چونکہ ہم اس سے بالطبع مانوس ہیں اور وہ ہمارے ہی اصلی جذبات کی تصویر کھینچتا ہے، اس لئے اب بھی اگر اس کمی کے پورا کرنے کی کوشش کی جائے تو ایک حد تک کامیابی کی امید ہو سکتی ہے۔ یوں تو ہندی شاعری کے بہت سے طبقے ہوئے جن کا ذکر یہاں خارج از مبحث ہوگا، لیکن جیسی ترقی کہ قدیم ہندوؤں نے فن ڈراما یعنی ناٹک میں کی، اُس کی مثال دوسری اقوام میں مشکل سے مل سکتی ہے۔ اگرچہ اب یہ بالاتفاق طے ہو گیا ہے کہ فن ڈراما کی ابتدا دوسرے فنونِ لطیفہ کی طرح قدیم یونان میں ہوئی اور وہیں سے یہ فن شریف ہندوستان میں آیا، لیکن ہندوؤں کی خداداد ذہانت اور عالی مرتبہ طباعی نے سنہ عیسوی کے پہلے ہی اُس کو ترقی کے ایسے زینے پر پہنچا دیا تھا جو یورپ کو (لگ بھگ) ہزار ڈیڑھ ہزار برس کے بعد سولہویں صدی عیسوی میں نصیب ہوا۔

ڈراما کو شاعرانہ جذبات کے اظہار سے خاص مناسبت ہے اور جیسی خوبی سے صحیفہ فطرت کا باریک مطالعہ اور قلب انسانی کے طوفان خیز جذبات کی کشمکش اور اُس کے پیچیدہ رازوں کا انکشاف ڈراما میں دکھایا جا سکتا ہے ایسا دوسری اصناف شاعری میں ممکن نہیں ہے۔ ہندو ڈراما میں برخلاف دوسرے اقسامِ سخن کے یہ خاص بات بھی ہے کہ وہ مذہبی اور روحانی رنگ سے بالکل معرا ہے اور اس لئے ہر کس و ناکس کے لئے سرمایۂ تعلیم و تفریح ہو سکتی ہے۔ پس ان ہی وجوہ سے ہم نے ارادہ کیا ہے کہ اگر مکروہات زمانہ سے فرصت ملے تو کبھی کبھی ہندو ناٹکوں کے بعض مؤثر سینوں کا ترجمہ اردو داں پبلک کے ملاحظہ میں پیش کیا کریں گے، تا کہ اُن کو معلوم ہو کہ دراصل منصب شاعر کیا ہے اور اس کو فطرتِ انسانی کا مطالعہ کیسی باریک نظری سے کرنا چاہئے اور

۱۹۰۹ء میں ملازمت سے سبکدوش ہو کر علی گڑھ آئے اور یہاں علی گڑھ کالج کے کاموں میں نواب وقار الملک کا ہاتھ بٹایا۔ ۱۹۱۰ء میں مسلم لیگ کے سکریٹری ہو کر لکھنؤ چلے گئے اور اس کام کو بھی اُسی محنت اور جانفشانی سے انجام دیا جس کے وہ عادی تھے۔ آخر ۱۹۱۲ء میں انتقال ہو گیا۔ آپ نے علم دوستی سے اردو میں بہت سی اچھی اچھی کتابیں (جہاں) دوسروں سے لکھوائیں اور ان کے لئے آسانیاں بہم پہنچائیں وہاں خود بھی تصنیف و تالیف کا بے حد شوق رہا اور ''گلگشت فرنگ'' اور ''سیرۃ المحمود'' کے علاوہ خود سنسکرت پڑھ کر کالی داس کے ڈرامے ''وکرم اروسی'' کا ترجمہ اردو میں کیا۔ اس کے علاوہ آپ نے متعدد مضامین بھی لکھے ہیں ''جو خیالات عزیز'' کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ مولانا عزیز مرزا کا طرز بیان شگفتہ اور سلیس ہے۔ خصوصاً مناظر فطرت کو لفظوں میں اس طرح بیان کرتے ہیں کہ آسمان آنکھوں کے سامنے پھرنے لگتا ہے۔ اردو نثر نگاری میں مناظر فطرت کی اتنی فطری مصوری ہمیں دوسرے نثاروں کے یہاں نہیں ملتی۔ اس کے علاوہ دوسرے مضامین میں بھی طرز بیان میں سلاست اور سادگی کے علاوہ ادبیت اور ہلکی سی رنگینی ہے۔ (اقبالِ ادب، مولفہ وقار عظیم، ۱۹۳۹ء، حصہ سوانح، ص۲۰ و ص۲۱ سے ماخوذ)

اُس کے مؤثر پیرایہ میں ظاہر کرنے کے لئے کیا طریقہ مناسب ہے۔

اُن کو یہ بھی معلوم ہوگا کہ شاعری کے رنگ وروپ کے لئے خزانۂ فطرت کا زیر بار احسان بننا ضروری ہے، ورنہ شعر پانی کی طرح پھیکے اور بے رنگ ہوں گے۔ اگر چہ ہندوؤں کی قدامت پرستی نے اپنی ہر چیز کو نا معلوم کے تاریک دھند لکے میں ایسا غائب کر دیا ہے کہ پتہ لگانا دشوار ہے، لیکن دقیقہ سنجانِ یورپ کا اتفاق ہے کہ جس قدر ہندو ڈرامے فی الحال موجود ہیں اُن میں مرچھ کٹیکا (کھیل کی گاڑی) سب سے قدیم ہے۔ یہ ڈراما سدراک راجہ اوجین سے منسوب ہے جس کی نسبت یہ تقریباً طے ہو چکا ہے کہ وہ پہلی یا دوسری صدی قبل مسیح میں گزرا ہے۔

یہ ناٹک علوئے خیالات، پر جوش جذبات، معرفت حقائق اور مطالعہ فطرت کے لحاظ سے اپنی آپ ہی نظیر ہے اور اس زمانے کی طرز معاشرت پر ایسی تیز روشنی ڈالتا ہے کہ پوری تصویر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔ اس ناٹک کی خوبیاں نہایت تفصیل سے بنگالہ کے مشہور عالم ڈاکٹر نشی کانت نے دو لکچروں میں بیان کی ہے اور جن لوگوں کو شوق ہو وہ ان سے فائدہ اُٹھا سکتے ہیں، چونکہ مرچھ کٹیکا سب سے قدیم ناٹک ہے، اس لئے مناسب یہی ہے کہ انتخاب کی ابتدا بھی اُسی سے کی جائے۔

ہم نے موسمی مناسبت سے ایک ایسا سین منتخب کیا ہے جس میں ابر و باراں کا لطف عجیب دلفریب پیرایہ میں دکھایا گیا ہے:

> ''......اور گو ہمارے اعمال کی بدولت اس وقت نسیم بہار کے بجائے بادِ سموم، کالی گھٹاؤں کے بجائے گرد و غبار کے دل بادل، نمو کے بجائے انحطاط، بارانِ رحمت کے بجائے سیل فنا اور ساون کی خوشگوار اور تسکین بخش جھڑیوں کے بجائے آگ سے زیادہ گرم اور تیر سے زیادہ تیز انسان کی شعاعیں انسان و حیوان کو بیتاب کر رہی ہیں، لیکن مشہور ہے اگر یار نہ ہو تو ذکر یار ہی باعث تسکین ہوتا ہے اور اس لئے کیا عجب ہے کہ تھکی ہوئی نگاہ کے لئے یہ گلزار صفحے ہی مرغزار کا کام دیں۔''

ناظرین ملاحظہ فرمائیں گے کہ سدرک نے برسات کے جنوں خیز مناظر کی تصویر کیسے تیز قلم سے کھینچی ہے اور اُن کو دیکھ کر جو وحشت انگیز، مگر دلکش جذبات پیدا ہوتے ہیں، ان کا سماں کس خوبی سے دکھایا ہے۔ اس سین کے پوری طرح سمجھنے کے لئے غالباً اس امر کا بتا دینا ضروری ہو کہ مرچھ کٹیکا کا ہیرو ایک نہایت نیک نفس اور شریف خاندان برہمن ہے جو اپنے فیاض ہاتھوں کی بدولت مفلس ہو گیا ہے اور ہیروئن ایک دولت مند حسین شاہد بازاری وسنت سینا ہے جس کا دل اپنے فرقہ کے آئین کے خلاف محبت و وفا سے معمور ہے۔

ویٹ صاحب یا اتالیق کو کہتے ہیں جس کو فن موسیقی میں خاص طور پر دخل ہوتا تھا۔ پس یہ سمجھنا چاہئے کہ شام کا وقت ہے اور وسنت سینا، ویٹ کے ہمراہ اپنے محبوب چاردوت کے یہاں جا رہی ہے کہ راستے میں گھٹا اُٹھتی ہے اور مینھ برسنے لگتا ہے اور اُسی حالت میں اُس کے اور ویٹ کے مابین یہ مکالمہ ہوتا ہے۔

اب شاعر کا کمال دیکھنا چاہئے کہ اس نے یہ دل رُبا منظر تین علیحدہ شخصوں کی نگاہ سے دیکھا ہے، جن کے دلوں میں مختلف قسم کے جذبات موجزن ہیں۔ سب سے پہلا تو ویٹ ہے جو محض اوپری نگاہ سے دیکھتا ہے۔ دوسرے وسنت سینا جس کو اشتیاق وصال اپنے محبوب کے گھر کھینچے لئے جا رہا ہے اور اس لئے وہ اس کو ایک عاشق مہجور کی نظر سے دیکھتی ہے۔ تیسرے چار دوت جو ایک خوش دل کامیاب عاشق کی حیثیت سے اُس پر نظر ڈالتا ہے۔

اب ذرا بادل کا ساز و سامان دیکھنا چاہئے کہ کیسی شان و شوکت سے قلم کوہ پر نمودار ہوتا ہے اور رعد کے نقارہ بجاتا اور بجلی کے پھریرہ اُڑاتا فضائے عالم پر حملہ آور ہوتا اور ہاتھیوں کی قطاروں کی طرح بجلی کی زنجیروں سے جکڑا ہوا منھ اُٹھائے نور کی جھڑیاں برساتا دوشِ ہوا پر چلا جاتا ہے اور بخارات کے اجتماع سے آسمان طوفانی سمندر معلوم ہونے لگتا ہے۔

اندھیرا اس بلا کا ہے کہ بجلی کی چمک سے بقول ملٹن کے تاریکی اور گہری ہو جاتی اور دن رات میں تمیز باقی نہیں رہتی اور دنیا فطرت کے ان ہولناک مناظر سے وہشت زدہ ہو کر ابر کے خوشگوار سایہ میں خوابِ راحت کے لئے لیٹ جاتی ہے اور پانی چھم چھم برس کر لوری دیتا ہے اور اُفق کی عجیب حالت ہے کہ کبھی بجلی سے دمک اُٹھتا اور کبھی

قوسِ قزح سے منور ہو جاتا ہے۔

بادل کبھی سمٹتا ہے اور کبھی پھیلتا ہے اور کبھی دھوئیں سے بخارات سانپ کی طرح لہراتے ہوئے آسمان پر چڑھتے ہیں۔ اگر بجلی کو دیکھوتو کبھی تو وہ شاہد ہرجائی کی طرح مطلع آسمان پر ہر طرف گشت لگاتی پھرتی ہے اور کبھی فوج علم کے لئے پھریرا بن جاتی ہے۔ کبھی آسمان کو مطلع انوار بناتی اور کبھی تاریکی کو اور گہرا کر دیتی ہے۔ کبھی فیل ابر کے لئے زنجیر بن جاتی اور کبھی بھولے بھٹکوں پر رحم کھا کر رہبری کرنے لگتی ہے۔ اب اگر وسنت سینا کے دردمند دل سے پوچھوتو اُس کو ابر کے گھٹاٹوپ اندھیرے کا صرف یہ مقصد معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے محبوب کے وصال سے محروم رہی اور بادلوں کے ہاتھیوں کی طرح جھومنے کی صرف یہ غرض ہے کہ اُس کے حزن و ملال میں ترقی ہو۔ گھنگھور گھٹا کی تاریکی دن کے نکلنے کے لئے ہے اور مینھ کی جھڑیاں غریب دیمک کے ٹیلے نیست و نابود کرنے کے لئے۔ بیچاری چاندنی بادلوں کے پیچھے چھپ جاتی ہے اور غریب کی جورو کی طرح ڈرتے ڈرتے جھانکتی ہے۔ ستاروں کا غائب ہونا اور تمام عالم پر تیرگی طاری ہو جانا، بادلوں کا کبھی برسنا، کبھی چڑھنا اور کبھی اُترنا اور کبھی جھک کر زمین سے مل جانا، کبھی گرج کر دھاڑنے لگنا، کبھی رو کر دریا بہانا اور کبھی آپ ہی آپ غصہ میں آ کر چہرے کا سیاہ کر لینا، مگر اشتیاق وصال ایسی چیز نہیں ہے کہ ان بلاؤں سے کوئی وفادار دل مرعوب ہو۔ بادل کڑکے، بجلی کوندے، آسمان پھٹ پڑے، مگر پائے ثبات سے نہیں ہل سکتے اور اگر ہلیں گے تو آگے ہی بڑھیں گے۔

اب کامیاب عاشق کو دیکھئے کہ اس کے نزدیک مینھ کی بوندیں اِندر کے خزانہ کے درِ شاہوار ہیں اور گھٹائیں کالی نہیں ہیں بلکہ کسی کی آمد آمد کے انتظار میں سیاہ غازہ مل کر آراستہ ہوئی ہیں اور بجلی کی ادائیں محض معشوقانہ ہیں۔ خوشی کچھ ایسی چیز ہے کہ ابھی جو چیزیں بھیانک معلوم ہو رہی تھیں وہی اب دلفریب نظر آ رہی ہیں بلکہ پریشانی بھی خود سمٹ سمٹا کر جمعیت کی شکل میں نمودار ہوتی ہے۔

اب یہ دیکھنا چاہئے کہ انسان کو چھوڑ کر حیوانات پر ان ہیبت ناک، مگر جانفزا مناظر کا کیا اثر پڑتا ہے۔ مورنیاں بادل کی گرج سنتے ہی بیدار ہو کر دیوانہ وار دوڑنے لگتی ہیں اور مینڈھک خوش خوش آبِ زلال سے پیاس بجھاتے ہیں۔ سارس کی چیخیں طنبورہ کی غم افزا گتیں معلوم ہوتی ہیں اور بگلوں کی قطاریں کبھی تو سیاہ ابر کو سفید بنا دیتی ہیں، کبھی فیل ابر کا سربند اور کبھی آسمان کے ہنسنے کے لئے دانت بن جاتی ہیں۔ کالی گھٹاؤں کا خیر مقدم ہر پرندہ اپنے خاص جذبات کے لحاظ سے کرتا ہے۔ مورنیاں تو چیخیں مار مار کر خوشیاں مناتی ہیں اور بگلے اُس کے دامنوں سے لپٹ لپٹ کر دل کے ارمان نکالتے ہیں، مگر دور اندیش مرغابیاں فکر و تردد کی نگاہ سے دیکھتی ہیں۔ اگرچہ یہ مناظر خود اس قدر دلفریب ہیں کہ کسی زرنگار چوکھٹے کی ضرورت نہ تھی، لیکن ہمارے شاعر نے ہر ایک مناظر کو برجستہ تشبیہات اور برموقع توجیہات سے خانۂ دل میں نگینہ کی طرح جڑ دیا ہے، چونکہ ناظرین یہ تماشہ خود سدرک کی نگاہ سے دیکھنے کے لئے بے قرار ہوں گے، اس لئے یہیں ختم کلام ہے۔

☆☆☆

ویٹ : بی بی سامنے پہاڑ کی چوٹی پر کسی پیاسے بچھڑے دُکھیارے کے دل کی طرح کالی گھٹائیں اُمنڈ رہی ہیں۔ اُن کی گرج نے مور مورنیوں کو بیدار کر دیا ہے جن کے پھڑ پھڑا کر اُڑنے سے آسمان کے نیچے ایک ایسا تلاطم برپا ہو گیا ہے کہ گویا ہزاروں مرقع رنگ برنگ کے جواہرات سے جگمگاتے ہوئے پنکھے جھلے جا رہے ہیں۔ ٹرواسی مینڈک آبِ باراں کے شفاف قطرے جو اُن کے منھ میں ان کے کیچڑ سے جبڑوں کو دھوتے ہوئے جاتے ہیں، مزے سے چوس رہے ہیں۔ مورنیاں جوشِ مسرت سے پیہو پیہو کرتی پھرتی ہیں اور نیپ کی تازہ کلیاں چٹکی پڑتی ہیں۔ رواں دواں اندھیرے نے چاند کو ایسا گم کر دیا ہے جیسے ریاکار اپنی شرخاک زندگی کو تقدس کے جامہ میں چھپا لیا کرتے ہیں۔ بجلی کسی حسن فروش مہ جبیں کی طرح جس کی نیک نامی تلون اور ہرجائی پن کی نذر ہو چکی ہو، ایک جگہ دم بھر نہیں ٹھہرتی بلکہ آسمان پر تڑپتی پھرتی ہے۔

وسنت سینا : واہ کیا کہنے، مگر مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دسواسی رات جو اندھیرے کے ساتھ مزے اُڑانے میں مصروف ہے، مجھے

اپنی سوکن سمجھ کر دور ہی سے روک رہی ہے اور جھلا جھلا کر لوٹا رہی ہے کہ میں کہیں اس کے عیش میں مخل نہ ہوں۔

ویٹ : تو تم بھی اُس کو ذرا کڑک کر جواب دو اور لعن طعن کر کے راہ پر لے آؤ۔

وسنت سینا : لعن طعن تو ہمارے فرقے کا زیور ہے، لیکن یہاں کچھ نہیں چلتی، لیکن ہاں! میں اس کی پروا کروں تو کیوں! بلا سے بدلیاں پھٹ پڑیں، بادل گرجیں اور مطلع آسمان سے بان پر بان و بکتے ہوئے گریں، مگر وہ جری عورت جس کا سینہ عشق و وفا سے معمور ہے، کبھی پیچھے نہیں ہٹ سکتی۔ اس کا قدم آگے ہی بڑھتا چلا جائے گا خواہ جنوں خیز طوفان کیسی ہی بلائیں نازل کرے۔

ویٹ : یہ ابر کا بڑا ٹکڑا کسی حملہ آور راجہ کی طرح جو اپنے مغلوب دشمن کے دارالسلطنت میں دربار کرنے کے لئے جا رہا ہو، ہوا کی فوج، جھڑیوں کے نوکدار تیروں اور بجلی کی جگمگ کرتی جھنڈیوں کے ساتھ رات کے راجہ پر خود اُس کے آسمانی قلعہ میں حملہ کرنے کے لئے بڑھ رہا ہے۔

وسنت سینا : نہیں نہیں ایسا نہیں ہے، میں خوب سمجھتی ہوں کہ دھواں دھار بادل جو کبھی بے ڈول ہاتھیوں کی طرح اپنی بھاری لاش سنبھالے جھومتے جھامتے بڑبڑاتے چلتے ہیں اور کبھی بگلوں کی منڈلاتی قطاروں سفید سے معلوم ہونے لگتے ہیں، دل کو غم کا سبق دینے کے لئے اُٹھے ہیں۔ سارس کی تیز چیخیں طنبورہ کے دلسوز ٹھپکوں کا کام کر رہی ہیں۔ جس پر کسی ہجر کی ماری دُکھیاری کی اُنگلیاں جس کا دل اپنے پیا کے پردیس سے واپس آنے میں پڑا ہو، تھاپ لگا رہی ہوں اور ہر سریلی گت جو موسم برسات کا خیر مقدم کرتی ہو اس کے لئے نمک پاش جراحت دل ہو۔

ویٹ : دیکھو وہ سامنے گراں ڈیل بادل ہاتھی کی طرح منھ اُٹھائے کھڑا ہے اور بگلوں کی سفید قطاریں اس کے سر بند باندھ رہی ہے اور بجلی نے کوند کوند کر سر پر چتور کر دی ہے۔

وسنت سینا : کیا خوب، دیکھا، یہ گھنگھور اندھیرا جو سیاہی میں تاڑ کے تر بتر پتوں کو مات کر رہا ہے۔ دن کو کیسا صاف نگل گیا اور وہ دیکھو سامنے دیمک کے ٹیلے مینھ کی جھڑیوں سے دب دبا کر اسی طرح غائب ہوتے جا رہے ہیں جیسے میدانِ جنگ سے تھڑولے ہاتھی تیروں کی بوچھار سے دُم دبا کر چپکے سے کھسک جایا کرتے ہیں۔ بیقرار بجلی ہر طرف مندروں کی طلائی قندیلوں کی طرح پرنور شعاعیں پھیلا رہی ہے اور ڈرپوک چاندنی غریب کی جورو کی طرح بادلوں کے پیچھے سے ڈرتی کانپتی جھانک رہی ہے۔

ویٹ : دیکھو وہ بدلیاں ہاتھیوں کی قطاروں کی طرح بجلی کی چمکدار رسیوں میں جکڑی اپنے عظیم الشان مالک کے احکام کی تعمیل میں خراماں خراماں جا رہی ہیں اور ایک چاندنی کی زنجیر سی آسمان سے زمین تک لٹک رہی ہے۔ نیلے فلک کے متحرک جسم سے جو باد بہاری کے ہلکے جھونکوں سے ہم آغوش ہو کر پھولا نہیں سماتا اور بجلی کے شعلوں سے کف بہ وہاں ہے، تیز جھڑیاں ہیرے کی، آنے والے تیروں کی طرح گر رہی ہیں اور سطح زمین میں جو گلہائے رنگارنگ سے مزین اور سوندھی سوندھی خوشبوؤں سے مہک رہا ہے، گھسی جاتی ہے۔ طوفان نے آسمان کا بعینہٖ ایسا نقشہ بنا دیا ہے کہ گویا سمندر کی تاریک موجیں تلاطم سے تنگ آ کر اُچھل اُچھل کر اپنا چمکتا ہوا سر ساحل سے ٹکرا رہی ہیں۔

وسنت سینا دیکھو! سامنے وہ گھنگھور گھٹا دھمکیاں دیتی ہوئی اُٹھی جس سے تمام زمین و آسمان تیرو تار ہو گیا۔ کیا لطف ہے کہ مورنیاں چیخ چیخ کر اس کا خیر مقدم کر رہی ہیں اور خوش طبع بگلے جوش مسرت سے اس کے دامنوں سے لپٹے جا رہے ہیں، مگر دور اندیش مرغابیاں اس پر فکر و تردد سے نظر جمائے ہوئے ہیں۔

ویٹ : آسمان اپنا چہرہ اندھیرے کی نقاب میں چھپائے ہوئے ہے جس کو بجلی کی تڑپ بھی بہ مشکل ہٹا سکتی ہے۔ دن اور

رات بدحواس سے ہوکر ایک ہوگئے ہیں اور ان کی کنول سی آنکھیں خوف کے مارے بند ہوئی جاتی ہیں۔ گویا کہ دنیا بادلوں کے خوش گوار سایہ میں جو آسمان کے کونے کونے پر چھا گئے ہیں، سونے کے لئے بستر ا ستراحت پر دراز ہے اور مینھ کے برسنے کی بھینی بھینی آواز لوری دے رہی ہے۔

وسنت سینا : سارے ستارے اس طرح غائب ہوگئے جیسے خبیث باطن لوگوں کے دل سے احسان کی یاد۔ مطلع آسمان نور سے اسی طرح عاری ہورہا ہے، جیسے شوہر کی غیر حاضری میں عورت کے چہرے سے رونق اُڑ جاتی ہے۔ درحقیقت ایسا معلوم ہورہا ہے کہ آسمان کوئی دم میں گھل کر بہہ جائے گا، کیونکہ وہ اِندر کے جہاں سوز بانوں سے پگھل پگھل کر پرشور سیلابوں میں، جوڑ کنے کا نام نہیں جانتے، اُمنڈ رہا ہے۔ کبھی بادل چڑھتے ہیں اور کبھی اُترتے ہیں اور کبھی جھک کر زمین سے لگ جاتے ہیں اور کبھی گرج کر دھاڑنے لگتے ہیں اور کبھی برس کر دریا بہاتے ہیں اور کبھی غصہ میں آخر چہرہ سیاہ کر لیتے ہیں۔

ویٹ : کبھی آسمان بجلی سے دمکنے لگتا ہے اور کبھی سفید بگلوں کی قطاروں کے دانت نکال کر ہنستا ہے۔ کبھی اندر کے سو تیر والی کمان (قوس وقزح) سے جگمگا اُٹھتا ہے اور کبھی اُس کے دَمکتے ہوئے بانوں کی زد (بجلی) سے کڑ کنے لگتا ہے، کبھی طوفانی ہواؤں کے تیز جھونکوں سے گھبرا کر لڑ بیٹھتا ہے اور کبھی سمٹے ہوئے بادلوں سے جو کالے ناگوں کی طرح لہراتے بل کھاتے چلے جارہے ہیں، گھنگھور گھٹا کی شکل میں اِن دھوؤں کا سرمئی لباس زیب بدن کئے جو اس وقت اُفق پر چھایا کرتے ہیں، جب کہ خوشبوؤں کے معطر بخور آسمان پر پیچ در پیچ زنجیر بناتے ہوئے چڑھتے ہیں۔

وسنت سینا : اے بادل تر ابرا ہو، تو مجھے کیوں کڑک کڑک کر دھمکیاں دے رہا ہے اور اپنے آبی تیروں سے کس لئے میرا راستہ روک رہا ہے۔ حالانکہ میں اپنے محبوب کے پاس جارہی ہوں۔ اے اِندر! سچ بتا میں نے کب تجھ سے عہد شکنی کی تھی کہ تو گرج گرج کر طعنے دے رہا ہے۔ تجھے میری راہ میں حائل ہونا زیبا نہیں ہے۔ اے اِندر! اگر کبھی تیرا دل لذت آشنائے اُلفت ہوا ہے اور کبھی تو اہلیہ کے شوہر کی شکل میں نمودار ہوا ہے تو میرے جذبات دل پر ترس کھا کر اپنے بادل ہٹا لے، لیکن خیر اگر تیری یہی مرضی ہے تو شور مچائے، موسلا دھار سیلاب برسائے اور اپنا سوہان والا گرز چلائے جا، لیکن سب بے فائدہ ہے تو کبھی اُس وفادار مہ جبین کا دامن نہیں پکڑ سکتا جو اپنے محبوب کے آغوشِ محبت میں خوف سے نجات پانے کی رَو میں چلی جارہی ہے۔ اگر تو گرج رہا ہے تو بلا سے گرجا کر، کیونکہ یہی تیری فطرت کا تقاضا ہے اور ظلم تیری طبیعت کا خاصہ ہے، مگر او نرم دل بجلی تو کیوں کر ان جذبات سے آشنا ہوگئی جو عورتوں کے سینوں میں تلاطم برپا کیا کرتے ہیں۔

(اس کے بعد وسنت سینا اپنے عاشق چار دوت کے مکان پر پہنچ جاتی ہے اور چونکہ پانی کا برسنا موقوف ہوگیا اور بھینی بھینی چاندنی چھٹکی ہوئی ہے، عاشق ومعشوق خانہ باغ کے ایک کونے میں بیٹھ کر لطف صحبت اُٹھاتے ہیں کہ اتنے میں پھر بوندیں ٹپاٹپ گرنے لگتی ہیں اور چار دوت کا دوست متبرے جو کسی قدر فاصلے پر بیٹھا ہوا ہے کہتا ہے: دوست دیکھو بادل پھر سمٹ سمٹ کر جمع ہورہے ہیں اور بڑی بڑی بوندیں یہاں سے اُٹھنے کا تقاضا کر رہی ہیں۔)

چار دوت : سچ ہے پانی کی بوندیں چھریرے بادلوں میں اسی طرح گھسی جارہی ہیں جیسے کنول کی ڈنڈیاں شاباش کیچڑ میں در آتی ہیں اور اب پھر آسمان کی آنکھوں سے جو چاند کے ہجر میں بے قرار ہے، آنسو جو کسی اور عالم کے معلوم ہوتے ہیں ٹپک رہے ہیں، بادل بلدیو (بلرام کا نام جو

سری کرشن جی کے بھائی تھے) کی طرح سیاہ لباس پہنے
اِندر کے خزانے سے خوش آب موتیوں کی لڑیاں برسا رہا
ہے اور مینھ کی بوندیں جو رشیوں کے دل کی طرح صاف و
شفاف ہیں ایسی تیز تیز کھڑکتی کھڑکاتی گر رہی ہیں جیسے
آتشی مزاج آدمی کے ترکش سے تیر۔ بی بی دیکھو آسمان
اپنے چہرے پر تاڑ کے سیاہ پتوں کا غازہ مل کر اور
بادِ بہاری کے تازگی بخش جھونکوں کے معطر پنکھوں کی ہوا
کھا کر بجلی کے ساتھ جو بے خوف اپنے محبوب کی طرف
بڑھی چلی جا رہی ہے، کیسی گرمجوشی سے بغلگیر ہوتا ہے۔
(وسنت سینا) بجلی کے کوندنے سے ڈر کر (چاردوت کے
چھاتی سے لپٹ جاتی ہے) چاردوت (سینے سے لگا کر)
او بادلو، گرجو بلکہ اور بھی زور شور سے گرجو جو تمہارے
بے سرے بھیانک راگ میں بھی مجھے نغمہ دلفریب کا لطف
آ رہا ہے، کیونکہ تمہاری ہی بدولت مجھے یہ دن نصیب ہوا
اور میرا دل اُمید وصال سے سیراب ہوا۔ (گویا کہ بادل
سے مخاطب ہو کر) او کالے منھ کے خبیث تو بھی بڑا ہی
بدمعاش ہے کہ میری مخدومہ کو اپنی بجلیاں کوندا کر ڈرا دیا۔

چاردوت : لعن طعن کا موقع نہیں ہے۔ پانی برستا ہے تو برسنے دو،
کیونکہ آسمان ابھی تک منھ چڑھائے ہوئے ہے اور بجلی
تڑپ تڑپ کر ہر طرف سینکڑوں شعلے مشتعل کر رہی ہے۔
بادلوں نے حقیقت میں مجھ پر عجب احسان کیا ہے کہ مجھے
اپنے من موہن سے ملا دیا، جس کے فراق میں بے قرار
تھا۔ خوش نصیب بلکہ کچھ اس سے بھی زیادہ وہ لوگ ہیں
جن کے گھروں کی چاردیواریاں اس بت شیریں کے
کام کی موجودگی سے منور ہوں جس کی پوجا اُن کا ایمان
ہے یا جن کے دست شوق اُن کے کپکپاتے جوبن کو اپنے
گرم سینہ سے چمٹا سکیں۔ دیکھو پیاری! آسمان پر اندر کی
کمان جوان ہاتھوں کی طرح تنی ہوئی ہے جو پھیلتے پھیلتے
تھک گئے ہوں، محراب بنا رہی ہے۔ آسمان انگڑائیاں
لے لے کر اپنی بجلی کی زبان نکال اور ابر کی ٹھوڑی لٹکا رہا
ہے اور یہ سب چیزیں ہم کو بھی زبان حال سے آرام
لینے کا اشارہ کر رہی ہیں۔ پس چلو سور ہیں۔ مینھ کی
بوندیں عجب سریلے پن سے گر رہی ہیں اور تاڑ کے
پتوں پر ٹپک اور زمین کے سنگریزوں سے ٹکرا اور بہتے
چشموں میں ایسی خوش آیند سر پیدا کر رہی ہیں جیسے کسی
اچھے گلے یا بین سے نکلتے ہیں۔

(اقبالِ ادب، مولفہ وقار عظیم، ۱۹۳۹ء ص ۱۵۹ تا ص ۱۷۳ سے ماخوذ)

❁❁❁

ادب کے بنیادی مطالبے

ادب انسانی زندگی کی طرح کھری حقیقت ہے، جس طرح زندگی کے بنیادی مطالبے خارجی حالات اور جغرافیائی اثرات سے محفوظ رہتے ہیں اور ہر رنگ و ہر مقام کے یکساں ہوتے ہیں، غور کیا جائے تو فنی تخلیق کے بنیادی تقاضے بھی وقت اور اس کے پیدا کردہ پیچیدہ سے پیچیدہ حالات کے تحت بھی برقرار رہتے ہیں۔ یہ کبھی نہیں بدلتے۔ ادب کے موضوعات بدلتے، تخلیقات میں نظریاتی تبدیلی پیدا ہوتی ہے، تہذیبوں کے اثر اور خارجی زندگی کے مظاہر سے یہ متاثر ہوتا ہے، مگر اس کی روح بہر حال بے داغ سچائی کی طرح محفوظ رہتی ہے۔ ادب کے بنیادی مطالبے زندگی کے تقاضوں اور ضرورتوں کی طرح اٹل ہے۔ ایک عام آدمی اور صاحب نظر کے مابین فرق یہ ہے کہ اوّل الذکر زندگی کو نہایت سچائی سے گزار دیتا ہے اور حیات کے عائد کردہ فرائض کی ادائیگی کو مقدم سمجھ کر ایمانداری سے عہدہ برآ ہونا چاہتا ہے، اس کے برخلاف ژرف نگاہی کا تقاضہ زندگی کی فلسفیانی جستجو ہے، مظاہر عالم سے تحیر کا اظہار اور حقائق کی تلاش کے لئے اُس کی قلبی بے قراری ہے اور اُس کی رنگا رنگ صورتوں سے آگاہی ہی نہیں بلکہ ضرورت اور منشا کے مطابق اُس میں رنگ آمیزی اور تبدیلی کا اعتماد بھی اور اس کلیہ میں ذرا شبہ نہیں کہ اعتماد حاصل ہوتا ہے پرخلوص ریاضت سے، اکتسابات سے، مطالعہ فطرت اور مطالعہ ادب سے، ایک ایسی مسلسل ''جان لیوا ریاضت'' سے جس سے رگوں میں دوڑنے والا لہو آنکھوں سے ٹپک پڑے۔ (اداریہ بعنوان ''افسانہ نما'' ماہنامہ ''میراث'' جھریا، مرتبہ غیاث احمد گدی، جنوری ۱۹۶۳ء، ج ۲ ش ۱، ص ۱۰ و ص ۱۱)

منظومات

محمد علی رضاؔ
Oriental College, Patana City - 800008

حمد باری تعالیٰ

الٰہی ترا نام رحمٰن ہے
یہی دیں ، یہی میرا ایمان ہے
تصرف میں ترے ہیں دونوں جہاں
نہیں تجھ سے بڑھ کر کوئی مہرباں
چمن میں بہاروں کو پیدا کیا
گلوں پہ عنادل کو شیدا کیا
اُگائے زمیں پر درخت و شجر
دیئے ان کی شاخوں کو برگ و ثمر
رواں ندی نالے سمندر کئے
فلک بے ستوں ہیں زمیں پر کھڑے
دیئے کان کو لولوئے بے بہا
صدف کے شکم میں گہر رکھ دیا
ہویدا کئے کیچڑوں میں کنول
زمیں کو دیئے کوہسار و جبل
نہیں صرف لوح و قلم ، عرش ہی
فلک بھی ترا ہے زمیں بھی تری
مہہ و مہر ، سنگ و حجر ، بحر و بر
تری شان ہرشئے میں ہے جلوہ گر
عجب تیری قدرت ، عجب شان ہے
یہ سارا جہاں زیر فرمان ہے
ہیں جتنے نبی ، زاہد و پارسا
سبھی تیرے دربار کے ہیں گدا
جسے چاہے ، کر دے اسے حکمراں
جسے چاہے دم میں کرے بے نشاں
ترا نور ہرشئے میں مستور ہے
تو آنکھوں سے ، لیکن بہت دور ہے
ادا تیری توصیف کیا ہو بیاں
دہن میں ہے عاجز ہماری زباں
مجھے دیں حق کا پرستار کر
درِ مصطفیٰ کا وفا دار کر
رضاؔ کی یہی تجھ سے ہے التجا
ہمیشہ اُسے راہِ حق پر چلا

❀❀❀

میکش اعظمی

Bairadeeh, P.o.- Lalganj, Dist.- Azamgarh - 276202 (Mob. 9919142755)

......اور تم نہیں آئے

شام جا چکی کب کی
رات آچکی کب کی
قہقہے پرندوں کے
گم ہوئے فضاؤں میں
خامشی کے دامن میں
سو گئے ہیں ہنگامے
آسمان ابر آلود
بجلیاں چمکتی ہیں
تیرگی مٹانے کو
اس مہیب منظر میں
منتظر نگاہوں کا
اک چراغ روشن ہے
اور تم نہیں آئے

شبنمی لباسوں میں
پھول سب مزین ہیں
خوشبوؤں کے نغمے سے
یہ فضا معطر ہے
جگنوؤں کی بارش سے
جا بہ جا اُجالا ہے
سرد سرد جھونکا ہے
بولتا دریچہ ہے
قافلہ ستاروں کا
آسماں کی بانہوں میں
پیار کی پناہوں میں
کب سے آکے ٹھہرا ہے
اور تم نہیں آئے

نرم رَو ہوا پیہم
ننھے ننھے پودوں کا
سوئے سوئے پیڑوں کا
اونچے اونچے ٹیلوں کا
دھول دھول رستوں کا
صاف صاف جھرنوں کا
چاند چاند چہروں کا
پھول پھول جسموں کا
بوسہ لے کے آتی ہے
وصل کا ، محبت کا
ایک گیت گاتی ہے
اور تم نہیں آئے

❀❀❀

مقاطع
سوداؔ

ہیں جو والی مرے بارہ دو جہاں میں سوداؔ
خاکِ دَر اُن کی سمجھتا ہوں میں زر سے بہتر

طلب نہ چرخ سے کر نان و راحت اے سوداؔ
پھرے ہے آپ وہ کاسہ لئے گدائی کا

اشارے کے بلانے سے ہوا رسوا ہے یہ سوداؔ
قیامت اُس پہ آوے گی جو تیرے قول پر ٹھہرا

تلاشِ خضر بہر منزل مقصد نہ کر سوداؔ
کوئی خود رفتگی سے راہبر بہتر نہیں ہوتا

ہے ضعف سے یوں نالہ ترا رونے میں سوداؔ
ساون میں پپیہے کی ہو جوں ٹیر ہوا پر

سوز تا سوز تفاوت ہے یقیں کر سوداؔ
داغ جو دل پہ ہے اپنے سو کہاں رکھتی ہے شمع

انیس نظمی

Makhsuspur, Champa Nagar, Bhagalpur - 812004 (Mob. 8757461273)

غزلیں

دلکشی کو سراب لکھ دینا
زندگی کو حباب لکھ دینا

ہم نے مانا حسین ہے دنیا
پر اسے ایک خواب لکھ دینا

کیا میں اس کی مثال دوں تجھ کو
تو اسے ماہتاب لکھ دینا

گرچہ ان میں صفت ہے کانٹوں کی
پھر بھی ان کو گلاب لکھ دینا

حسن بیتاب جب نظر آئے
عشق کو کامیاب لکھ دینا

کربِ دنیا کا حال جب لکھنا
میرا بھی اضطراب لکھ دینا

یہ جو چڑھتا شباب ہے ، اس کو
ڈوبتا آفتاب لکھ دینا

خونِ دل کو ہمارے اے نظمیؔ
تو جو چاہے تو آب لکھ دینا

❁❁❁

نیند ادھوری رہ گئی ، سپنا ادھورا رہ گیا
حسرتِ ناکام کا قصہ ادھورا رہ گیا

نبض بے حرکت ہوئی اور ہاتھ سے چھوٹا قلم
قصہ دلگیر کا حصہ ادھورا رہ گیا

تیغ نفرت سے مصور کی ہتھیلی کٹ گئی
امن کی تصویر کا نقشہ ادھورا رہ گیا

مفلسی اس کی ، اُسے چھونے دیا نہ چاند کو
علم کے میدان میں بچہ ادھورا رہ گیا

میں کہاں قلاش کا بیٹا ، وہ بنت اہل زر
اُس سے میرے پیار کا رشتہ ادھورا رہ گیا

زندگی بھر کی تپسیا ہوگئی لمحوں میں بھنگ
امتحانِ نفس میں بابا ادھورا رہ گیا

❁❁❁

عطاؔ عابدی
C/o Book Emporium Sabzibagh, Patna - 800004

غزل

تمہارے غم سے کسے ہے فرصت ، نہیں ہے فرصت ، نہیں ہے فرصت
کبھی ہو فرصت تو آکے دیکھو ، ہماری کتنی حسیں ہے فرصت

قدم قدم گھر سفر میں رکھنا ، کسی کا چہرہ نظر میں رکھنا
کچھ اس قدر دل نشیں ہے فرصت ، اگرچہ عزلت نشیں ہے فرصت

جو باہنر میں یہاں پہ ہوتا تمہاری یادوں کو روز کھوتا
یہ میری نااہلی کا صلہ ہے تمہارے غم کی امیں ہے فرصت

بہر سو حیرت فزا ایجادیں ، بہر سو پھیلی خموش گاہیں
جو دیکھو تو یہ فلک ہے محنت ، جو سوچو تو یہ زمیں ہے فرصت

اسے بھی رونا جہان کا ہے ، اسے بھی شکوہ تکان کا ہے
وہی جو ہر کام سے بری ہے ، وہ جس کے سر پر مکیں ہے فرصت

میں ریزہ ریزہ بکھر رہا ہوں میں لمحہ لمحہ سنور رہا ہوں
میں ایسی آواز سن رہا ہوں جو کہہ رہی ہے قریں ہے فرصت

اگرچہ دنیا عمل کی جا ہے ، مگر یہ غفلت کی انتہا ہے
کہ میرے دل کو یقیں نہیں ہے ، یہیں ہے فرصت ، یہیں ہے فرصت

❁❁❁

سمیع احمد ثمر

Deptt. of Urdu, Delhi University, New Delhi - 110007 (Mob. 7488820892)

غزلیں

جو تصور میں ہیں جذبات کسے پیش کروں
اپنی غزلوں کی یہ سوغات کسے پیش کروں

پھر سلگنے کو ہے چنگاری وفا کی دل میں
میں نگاہوں کے اشارات کسے پیش کروں

کوئی ہمدرد زمانے میں مجھے مل نہ سکا
غم میں ڈوبے ہوئے حالات کسے پیش کروں

عرش پر چاند نہیں ، وہ بھی خیالوں میں نہیں
غمزدہ ہجر کی یہ رات کسے پیش کروں

دے کے شادی کی انہیں آج مبارک بادی
دوستو یادوں کی بارات کسے پیش کروں

یہ تو بتلا دے قطع پیار کو کرنے والے
اس زمانے میں ترا ہات کسے پیش کروں

کوئی آئے نہ نظر اردو کا پڑھنے والا
میں ثمر اپنی ہی خدمات کسے پیش کروں

❋❋❋

اب کسی چال ، اشارے میں نہیں آئیں گے
ہم کو مت دیکھئے جھانسے میں نہیں آئیں گے

جن کے آگے ہے بھنور اور ہے پیچھے طوفاں
وہ سفینے تو کنارے میں نہیں آئیں گے

انجمن میں جو اُٹھے مدعے یہی لگتا ہے
اب کبھی بھی وہ خلاصے میں نہیں آئیں گے

گھر کے بٹوارے کا منظر بھی ہے محشر جیسا
بھائی بھائی کے جنازے میں نہیں آئیں گے

ان کے کوچے میں تو ہر دن ہی مریں دیوانے
ہم کبھی ایسے تماشے میں نہیں آئیں گے

بے رخی دیکھ کے لگتا ہے یہی مجھ کو ثمر
اچھے دن میرے زمانے میں نہیں آئیں گے

❋❋❋

مطالع زیبا

وہ نبض کی رفتار کہ چھٹتے ہیں پسینے
لگتے نہیں دنیا ترے جینے کے قرینے (آنند نرائن مُلّا)

یوں تو پہنے ہوئے پیراہن خار آتا ہوں
یہی کیا کم ہے بہ سودائے بہار آتا ہوں (احمد ندیم قاسمی)

پریشاں ہوگئے ہم صورتِ گردِ سفر آخر
کہاں تک ساتھ دیوانوں کا دیتی رہ گزر آخر (غلام ربانی تاباں)

تھکے لوگوں کو مجبوری میں چلتے دیکھ لیتا ہوں
میں بس کی کھڑکیوں سے یہ تماشے دیکھ لیتا ہوں (منیر نیازی)

سلطان مظفر آزاد

Secretary "Bazm-e-Noor" Chowdhrana, Arrah - 802301 (Mob. 7301916565)

غزلیں

نظر آئے جلوے نظاروں سے پہلے
بہار آگئی ہے بہاروں سے پہلے

میں احوالِ دل غیر کو کیوں سناؤں
کہو حالِ دل یار غاروں سے پہلے

میں چاند اور تاروں کے جھرمٹ میں رہ کر
سجاؤں گا گلشن بہاروں سے پہلے

زمیں کانپ اُٹھی ہے ظلم و ستم سے
قمر چھپ گیا ہے ستاروں سے پہلے

یہ کیسی ہے قدرت خدا کی زمیں پر
یہ نغمہ سنو آبشاروں سے پہلے

حسینوں کی محفل میں آزاد سن لو
اداؤں کو سمجھو اشاروں سے پہلے

❁❁❁

کس کس طرح سے کھائی قسم پیار کے لئے
انکار کے لئے ، کبھی اقرار کے لئے

سجدے بھی کر نہیں سکے اپنی زمین پر
لوگوں نے وقف کر دیئے اغیار کے لئے

ہر دل میں زہر بھر دیا کچھ اس طرح سے آج
باقی ذرا جگہ نہ بچی پیار کے لئے

ان رہزنوں کے شہر میں امن و اماں کہاں
ہر لمحہ دل میں خوف ہے زر دار کے لئے

آزاد کیسے ہم کریں دونوں کو خوش یہاں
آپس میں اختلاف ہے گھر بار کے لئے

❁❁❁

ابیاتِ خواتین

برکھا رُت میں بادل لے کر کس کا یہ سندیسا آیا ہے
آنکھیں ایسی شرمائیں کیوں، آنچل کیوں لہرایا ہے (عذرا پروین)

اُن سے اک تعلق ہے صرف غم گساری کا
کب یہ ٹوٹ جائے گا اُس گھڑی سے ڈرتی ہوں (شہناز مزمل)

ہر لمحہ احتساب میں رہنا ہی تھا مجھے
پنہاں عذابِ ذات کی جب شاعرہ ہوں میں (سکینہ ساجد پنہاں)

یہ بھی اچھا ہی ہوا اب حوصلہ باقی نہیں
دیکھ سکتی تو نہ جانے اور کیا کیا دیکھتی (سمینا راجہ)

غم دیدہ لڑکیوں کو نہ جانے یہ کیا ہوا
ہاتھوں میں جیسے بوجھ سی لگتی ہیں چوڑیاں (شعلہ نگار)

لاکھ پتھر ہوں ، مگر لڑکی ہوں
پھول ہی پھول ہیں اندر میرے (عسرت آفریں)

محسن باعشن حسرتؔ

4, Princep Street, 1st Floor, Kolkata -700072 (Mob. 8777567705)

غزلیں

بکھرا کے گیسوؤں کو وہ اپنے جدھر گئے
راہوں میں پھول حد نظر تک بکھر گئے

جو کام تھا نہ کرنا ، وہی کام کر گئے
دریا میں لوگ سوچے بنا ہی اُتر گئے

اپنے گلے سے لوگوں نے ہم کو لگا لیا
نذرانہ ہم خلوص کا لے کر جدھر گئے

دیکھا جو مسکرا کے ہمیں تم نے اک نظر
جتنے ہمارے زخم تھے اک پل میں بھر گئے

کر پائیں گے مقابلہ کیسے وہ دھوپ کا
وہ لوگ جو خود اپنے ہی سائے سے ڈر گئے

حسرتؔ چلو کہ لوٹ چلیں ہم بھی اپنے گھر
پنچھی بھی شام ہوتے ہی سب اپنے گھر گئے

❁❁❁

ڈھونڈ کر ملتے نہیں پچھلے زمانے والے
گم کہاں ہوگئے وہ پیار جتانے والے

ہوں گے وہ اور چراغوں کو بجھانے والے
ہم تو ہیں خون سے شمعوں کو جلانے والے

دیکھ لینا تمھیں بھی نیند نہیں آئے گی
میری آنکھوں سے مری نیند چرانے والے

صبر کی دی ہے خدا نے ہمیں دولت کافی
ہم کسی طور نہیں اشک بہانے والے

بے سبب بند حوالات میں رکھا جن کو
تھے پریوار کے وہ تنہا کمانے والے

دل کہے گا جو ہمیں ہم وہ کریں گے حسرتؔ
کچھ بھی کہہ لیں ہمیں اب چاہے زمانے والے

❁❁❁

قطعاتؔ

فضاؔ ابن فیضی

آغوشِ گل تر میں ابھی رہنے دے
اِس نشہ کو ساگر میں ابھی رہنے دے
میری نگہ و فکر کی تابانی کو
اپنے پس منظر میں ابھی رہنے دے

❁❁❁

مختار ہوں ، مجبور ہوں ، معلوم نہیں
مرہم ہوں کہ ناسور ہوں ، معلوم نہیں
پلکوں پہ جو آنسو ہیں ، تو ہونٹوں پہ ہنسی
شاداں ہوں کہ مجبور ہوں ، معلوم نہیں

❁❁❁

ماحول کی تاثیر بدل جاتی ہے
الفاظ کی تفسیر بدل جاتی ہے
ہے موت بھی سچ پوچھو تو اک قید حیات
بس پاؤں کی زنجیر بدل جاتی ہے

خالق حسین پردیسی کابری
Nanhe Khan ki Gali, Panchaiti Akhara, Gaya - 823001 (Mob. 9905487173)

غزلیں

لگتا ہے خوف اب مجھے ذکر نشاط سے
نکلے ہیں برسوں بعد غم انحطاط سے

نا آشنا تھے ہم تو کوئی جانتا نہ تھا
رسوائیاں ملی ہیں ترے ارتباط سے

اشکوں کے بدلے ٹپکے لہو جب تو ہنس دیئے
کیا ربط میرے کرب کو ہے انبساط سے

ہوش وخرد ہے باقی تو عشاق ہی نہیں
دیوانے کام لیں گے کہاں احتیاط سے

ہر اک قدم پہ ایک قیامت ہے منتظر
''ہرسانس ہے گزرتی یہاں پل صراط سے''

شاید کہ منتظر ہوں فرشتے ، وضو کریں
دامن نچوڑنا ہے مجھے احتیاط سے

پردیسی سنگ باری کا مطلق الم نہیں
کم ظرف تھے نکل گئے اپنی بساط سے

❁❁❁

جان و جگر نثار کبھی کرکے دیکھئے
ان کو بھی بے قرار کبھی کر کے دیکھئے

مہکے گا گلستاں کی طرح جسم آپ کا
اُس گلبدن سے پیار کبھی کر کے دیکھئے

سمجھیں گے لوگ قیس کی مانند آپ کو
اپنا گریباں تار کبھی کر کے دیکھئے

برسیں گے صرف طنز کے پتھر ہی آپ پر
محفل میں آنکھیں چار کبھی کر کے دیکھئے

شمع جلے جلے ، نہ جلے ، دل جلایئے
اس طرح انتظار کبھی کر کے دیکھئے

ہردم سکون و چین میں جیتے رہیں گے آپ
''دشواریوں سے پیار کبھی کر کے دیکھئے''

سولی پہ لوگ کیسے چڑھاتے ہیں آپ کو
خود کو گناہگار کبھی کر کے دیکھئے

پردیسی کیا ملے گا خزاؤں کی گود میں
رُخ جانب بہار کبھی کر کے دیکھئے

❁❁❁

فرزانہ پروین

Asststant Teacher, The Quraish Institute, 5/1, Kimber Street, Kolkata - 700017
(Mob. 7003222679)

غزلیں

اب حوصلہ جدائی کا لائیں کدھر سے ہم
مجبور ہیں وہ دل سے ، ہیں بے بس جگر سے ہم

ہوں گے حسد سے باؤلے کتنے ہی لوگ آج
دیں گے تری مثالیں جو شمس و قمر سے ہم

تنہائی میں یہی تو ہمارا ہے مشغلہ
کرنے لگے ہیں گفتگو دیوار و دَر سے ہم

ہم نے ہمیشہ مانی ہے اپنے ضمیر کی
کیوں جبر خود پہ کرتے زمانے کے ڈر سے ہم

یادیں کئی پرانی ستانے لگیں ہمیں
گزرے جو برسوں بعد تری رہ گزر سے ہم

منظر تمام دھندلے تھے آنکھوں کے سامنے
کرنے لگے جو یاد انہیں چشم تر سے ہم

دونا ہوا ہے درد اسے دیکھ کر قریب
یہ بات کیسے کہہ دیں بھلا چارہ گر سے ہم

شاید ہم ایسے اور حسیں تر دکھائی دیں
دیکھیں گے خود کو شیشے میں ان کی نظر سے ہم

ڈھانے لگا ہے ظلم و ستم اک نیا یزید
ہم ہیں حسینی ، پھر بھی نہیں نکلے گھر سے ہم

❁❁❁

اگر وہ میرے لئے آج بے قرار نہیں
تو کہہ دو ، مجھ کو بھی اب اس کا انتظار نہیں

مجھے یقین ہے اک روز موت آئے گی
مگر تم آؤ گے ، اس کا تو اعتبار نہیں

ہر ایک شخص کے غم اپنے ، درد اپنے ہیں
جہاں میں ہے کوئی ، دل جس کا سوگوار نہیں؟

برسنے لگتی ہیں جاتے ہی روبرو اس کے
یہ میری آنکھیں بھی اب میری راز دار نہیں

ہر ایک فرد سمجھتا ہے بوجھ دوجے کو
وہ کون گھر ہے جہاں رشتوں کا مزار نہیں

تماشا دیکھ رہے ہیں ستم شعاری کا
ہم اپنے آپ سے کیوں ہوتے شرمسار نہیں

عجیب بازی ہے یہ دل کی بازی فرزانہؔ
کہ جیت جیت نہیں اور ہار ہار نہیں

❁❁❁

نام کتاب	:	چہرہ سوال ہے		
مصنف	:	خورشید اکبر		
ناشر	:	ارم پبلشنگ ہاؤس، پٹنہ		
اشاعت	:	۲۰۲۵ء	صفحات :	۲۰۰
قیمت	:	۵۰۰ روپے		
مبصر	:	اظہار خضر		

’’چہرہ سوال ہے‘‘ معروف ادیب وشاعر جناب خورشید اکبر کی ۱۴۰۲اشعار پر مشتمل ایک ہی ردیف میں کہی گئی طویل ترین غزل کتاب ہے۔ شاعر کا دعویٰ ہے کہ یہ دنیا کی طویل ترین اردو غزل کی کتاب ہے۔ ممکن ہے کہ ایسا ہی ہو، پھر بھی یہ ایک تحقیق طلب معاملہ ہے، کیونکہ یہ عین ممکن ہے کہ دوسرے صاحبان علم وفن کی ایک ہی ردیف میں کہی گئی غزل کی تعداداس سے زیادہ ہو۔ خیر اس قیاسی گفتگو سے قطع نظر کتاب میں مختلف عنوانات کے تحت جو اٹھارہ ابواب قائم کئے گئے ہیں اور جو سوالات قائم کئے گئے ہیں ان میں موضوعات کی سطح پر تنوع کے ساتھ ساتھ فکر وفلسفہ کی مختلف نوعیتیں بھی دیکھنے کو ملتی ہیں ۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاعر کا تخلیقی ذہن حد درجہ تجسس پسند اور تجرباتی ہے۔

غزل کی طوالت کے پیش نظر ’’شہرآمد‘‘ کے تحت کتاب کا آغاز بارہ مطلعوں سے ہوتا ہے۔ یہ بارہ مطلع ایک قسم کی تمہید (Prologue) ہیں جو پوری غزل کتاب کے تخلیقی رجحان وفکر کی نمائندگی کرتے نظر آتے ہیں۔

زیر نظر کتاب کا انتساب ’’تمام صوفیوں اور سنتوں کے نام‘‘ ہے۔ اس سے شاعر کے صوفیانہ تخلیقی مزاج وفکر کا پتہ چلتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی جس شعر کو درج کیا گیا ہے وہ سوالات کے ایک سلسلے کا آغاز کرتا محسوس ہوتا ہے۔ میرے نزدیک یہ بارہ مطلع شاعر کے اختراعی اور تجرباتی تخلیقی ذہن کے غماز ہیں، کیونکہ مذکورہ پوری غزل کتاب ہی شاعر کی ہیئت پسندانہ تجرباتی تخلیقی کاوش کا نتیجہ ہے۔ سرنامہ کے طور پر جس شعر کو انتساب میں درج کیا گیا ہے، وہ آپ بھی سن لیجئے ؎

حیرت فروش ریزہ ہے ، تازہ سوال ہے
آئینہ چور چور ہے چہرہ سوال ہے

اس شعر کو Prologue کی صورت میں دیکھئے اور سمجھئے۔ آپ جانتے ہیں کہ غزل میں مطلع کا تخلیقی جواز اور اس کی اہمیت اگر ہے تو صرف اس لئے کہ یہ پوری غزل کے فکری رجحان کی تفہیم وتعبیر میں کلیدی رول ادا کرتا ہے۔

مندرجہ بالا شعر کا دوسرا مصرع ہی اس کی جان ہے، لیکن پہلے مصرع اولیٰ میں ’’حیرت فروش ریزہ‘‘ پر غور فرمائیے۔ سوال تازہ اس لئے ہے کہ آئینہ کی ریزہ کاری اس کی حیرت فروشی کا سبب بنتی ہے۔ سوال یہی ہے کہ ریزہ کاری اس کی حیرت فروشی کا سبب کیوں کر بنتی ہے۔ ظاہر ہے کہ آئینہ چور چور ہو گیا ہے اور چہرہ اپنی جائے اماں اور بے ثباتی پر حیران و پریشان ہے۔ جب آئینہ چور چور ہو گیا ہے تو پھر چہرہ کا سوالی ہونا ایک فطری امر واقعہ ہے۔ ٹکڑے ٹکڑے میں بکھرے آئینہ میں چہرے کا بھی ٹکڑا ٹکڑا ہونا ایک فطری امر واقعہ ہے۔ چہرہ اپنی بگڑی ہوئی شبیہ کی وجہ سے ہی سوال کرتا ہے ۔ چہرے کا سوالی ہونا کشاکش حیات کے حوالے سے ایک اچھوتا اور منفرد تخلیقی نمونہ ہے، مزید یہ کہ ’’حیرت فروش ریزہ‘‘ کی ترکیب تو لاجواب ہے۔ اسی کو قادرالبیانی کہتے ہیں، جہاں زبان اپنی جدلیاتی صورت گری (Dialective Form) کے نتیجے میں ایک تخلیقی زبان کی صورت اختیار کرتی نظر آتی ہے۔ میرے نزدیک ’’حیرت فروش ریزہ‘‘ ایک استعاراتی تخلیقی اظہار ہے جو اس کی جدلیات کو وضع کرتا ہے۔ شعر کی تشکیل اسی نہج پر ہوتی ہے۔ یہ ایک بالکل غیر شعوری تخلیقی عمل ہے۔

اب یہ دیکھئے کہ اس پوری غزل کتاب میں جو سوالات قائم

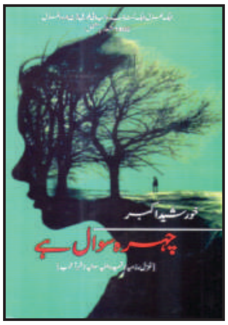

کئے گئے ہیں ان میں موضوعاتی تنوع کی عکس ریزی کے ساتھ کس قسم کی تخلیقی نوعیتیں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ تیرہ ابواب میں جو مختلف شہر آباد کئے گئے ہیں ان میں تحیرات، جلال و جمال، معرفت و شہادت، احتجاج، شہر آشوب، شہر تفنن جیسے ذیلی عنوانات کے وسیلے سے شاعر نے اپنی تخلیقی نوعیّتوں کو مدحیات، عرفانیات، آفاقیات، شکوۂ حیات، تشبیب، گریز، مدحیات، بہاریہ جیسی صورتوں میں وضع کرنے کی کوشش کی ہے اور بلاشبہ ان میں فکر و فلسفہ کا ایک جہانِ معنی آباد ہے۔

یہاں فنی نقطۂ نظر سے مصرع ثانی کا ردیف ہی سوالیہ انداز بیان کا تخلیقی منطقہ ہوتا ہے، کیونکہ اگر مصرع اولیٰ میں اس طریقۂ کار کو اپنایا گیا تو پھر اس کی فنی ترتیب تو بگڑے گی ہی ساتھ ہی شعر اپنی مضحکہ خیزی اور بھونڈے پن کی چغلی کھاتا نظر آئے گا، چنانچہ تشبیب والے حصے میں شہر تحیرات کے تحت مصرع ثانی میں جو سوالات قائم کئے گئے وہ سب کے سب اپنی تخلیقی معنویت کا جواز پیش کرتے نظر آتے ہیں، مثلاً عجوبہ سوال ہے، خرقہ سوال ہے، دنیا سوال ہے، نوحہ سوال ہے، چہرہ سوال ہے وغیرہ۔ شہر جمال میں بھی اسی قسم کی سوالیہ تراکیب دیکھنے کو ملتی ہیں۔ مثلاً ’’فقرہ سوال ہے‘‘، ’’جھما کا سوال ہے‘‘، ’’نوالہ سوال ہے‘‘، ’’اشارہ سوال ہے‘‘، ’’نقطہ سوال ہے‘‘ وغیرہ۔

تشبیب کے حوالے سے شہر تحیرات میں ایک شعر پیش کر کے اس گفتگو کو ختم کیا چاہتا ہوں ؎

دنیا میں خوشبوؤں کی حکومت بنے گی کب
کب سے مرے نبی کا پسینہ سوال ہے

شعر دامن کش دل ہے۔ اس پر مزید گفتگو سے احتراز کرتے ہوئے سوالیہ انداز بیان کے حوالے سے بیان کردہ موقف کی تائید میں داغؔ دہلوی کے دو چار شعر سن لیجئے ؎

تمہارے خط میں نیا اک سلام کس کا تھا
نہ تھا رقیب تو آخر وہ نام کس کا تھا

وہ قتل کر کے مجھے ہر کسی سے پوچھتے ہیں
یہ کام کس نے کیا ہے، یہ کام کس کا تھا

رہا نہ دل میں وہ بے درد اور درد رہا
مقیم کون ہوا ہے، مقام کس کا تھا

تمام بزم جسے سن کے رہ گئی مشتاق
کہو وہ تذکرۂ ناتمام کس کا تھا

ہر اک سے کہتے ہیں کیا داغؔ بے وفا نکلا
یہ پوچھے ان سے کوئی وہ غلام کس کا تھا

لیکن استثنائی صورت حال بھی دیکھنے کو ملتی ہے۔ غالبؔ کے متداول دیوان کی پہلی غزل کے پہلے شعر کے مصرع اولیٰ میں ہی سوالیہ انداز بیان دیکھنے کو ملتا ہے ع

نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا

غالبؔ ایک باکمال شاعر تھے۔ اس قسم کی اجتہادانہ تخلیقی صورت حال ان کے کلام میں جا بجا دیکھنے کو ملتی ہے۔ یہ ان کے کمال فن کا نتیجہ ہے۔ حالانکہ زیر گفتگو کتاب میں بھی یہ صورت دیکھنے کو ملتی ہے۔ کتاب کے آغاز میں تمہید کے طور پر جو بارہ مطلع درج ہیں ان میں شاعر خورشید اکبر نے شعر کے مصرع اولیٰ اور مصرع ثانی دونوں ہی میں سوالیہ شعری بیانیہ کے فنکارانہ تخلیقی اظہار کو ملحوظ رکھا ہے ؎

صحرا کے اضطراب پہ دریا سوال ہے
تپتی ہوئی زمیں پہ سفینہ سوا ل ہے

یوں گول ہے، مٹول ہے، الجھا سوال ہے
شیریں دہن جواب ہے تیکھا سوال ہے

جس طرح ریگ زار پہ چشمہ سوال ہے
پتھر پہ آبشار کا صدمہ سوال ہے

لیکن اس استثنائی صورت حال سے قطع نظر عمومی طور پر مصرع ثانی ہی سوالیہ شعری بیانیہ کا تخلیقی منطقہ قرار پاتا نظر آتا ہے، ایسا میرا خیال ہے۔

اب تک کی گفتگو میں، سوالات کے موضوعاتی تنوع اور ان کی فنی پیش کش کے حوالے سے چند معروضات زیر بحث لائے گئے

ہیں۔اب اس پہلو پر بھی چند باتیں سنتے چلئے کہ مذکورہ غزل کتاب میں قائم کئے گئے سوالات کی تخلیقی نوعیتیں کس قسم کی ہیں اور شاعر کا فکری آمیزہ کس قسم کا ہے؟

خاکسار ایسا محسوس کرتا ہے کہ کتاب مذکور کے تمام تر سوالیہ شعری بیانیے شاعر کی دردمندیوں اور فکرمندیوں کا نتیجہ ہیں۔ٹوٹتی، پھوٹتی قدروں اور مسلمہ ابدی حقیقتوں سے انحرافانہ ذہنی رویہ وہ عقبی زمین ہے جو اس کی تخلیق کے لئے خام مواد فراہم کرتی ہے اور اسی راستے سے المیوں کی رنگ آمیزی دیکھنے کو ملتی ہے۔ زیادہ تر قائم کردہ سوالات المیہ نگاری کا ایک عمدہ تخلیقی نمونہ ہیں۔ مذکورہ غزل کتاب کے زیادہ تر شعری بیانیوں میں المیاتی حسن کا رنگ حد درجہ نکھرا ہوا نظر آتا ہے اور یہی اس کی جمالیات ہے۔ٹریجڈی کی جمالیات کی تخلیقی فنکاری اسی راستے سے نمو پاتی ہے، چند اشعار حاضر خدمت ہیں ؎

دنیا میں خوشبوؤں کی حکومت بنے گی کب
کب سے مرے نبی کا پسینہ سوال ہے

نازک ہزار پھول سے زیادہ ہے کنکری
اصحابِ فیل ہوگئے بھوسا سوال ہے

یہ بت کدہ حسین ہے نقش و نگار سے
تیرے سوا کوئی نہیں کلمہ سوال ہے

کافر خدا کے فضل سے آگے نکل گئے
مومن پہ کیوں عذاب ہے دُہرا سوال ہے

(شہرِ معرفت:''عرفانیات'')

کوئی زمیں پہ رہ کے بلند آسماں ہوا
تحت الشعور سے یہ اُبھرتا سوال ہے

(شہرِ احتجاج:''ردِّعملیات'')

اس سے بڑی ٹریجڈی اور کیا ہوسکتی ہے کہ نبی کا پسینہ سوال کررہا ہے کہ دنیا میں خوشبوؤں کی حکومت کب بنے گی۔ وہ نبی جس نے اپنے پسینے سے انسانیت اور امن وآشتی کی جڑوں کو سینچا، حالانکہ اس خواب کی نمو پذیری تو بے شک ہوئی، لیکن یہ خواب اب بھی عالم انسانیت کے سامنے ایک سوال بن کر کھڑا ہے کہ اخوت ومحبت اور خوشبوؤں کی جڑیں کیوں سوکھتی چلی جارہی ہیں۔اس شعر پر بھی غور فرمائیے کہ کافر خدا کے فضل سے آگے نکل گئے اور مومن کیوں عذاب میں مبتلا ہے؟ شاعر کا یہ سوالیہ انداز بیان اس کی فکرمندیوں اور دردمندیوں کا اشاریہ ہے۔اس فکر وفلسفہ پر بہت ساری بحثیں ہوسکتی ہیں اور یہ بھی کہ خدا کے فضل سے کافر آگے کیوں کر نکل گئے؟ کیا واقعی یہ خدا کا فضل ہے یا پھر یہ دنیا کی وقتی اور لمحاتی آسائشوں کی بھول بھلیّاں ہیں، جن سے اجتناب کرنے کا ہمیں یہاں درس دیا گیا ہے۔

میرے نزدیک شاعر کی یہ تخلیقی کر بنا کیاں اس کے فن کو ٹریجڈی کی جمالیات سے قریب تر کرتی ہیں۔ممکن ہے کہ آپ شاعر کی اِن دردمندیوں اور فکرمندیوں کو Lofty Ideas پر محمول کریں، لیکن میرے نزدیک فکر وفن کی اس سے بہتر توجیہ پسندی اور نہیں ہوسکتی۔

آپ جانتے ہیں کہ غزل کا ہر شعر ایک آزادا کائی ہوتا ہے اور ہر شعر میں فکر ومعنی کی ایک الگ دنیا آباد ہوتی ہے، لیکن ۱۴۰۲ اشعروں پر مشتمل غزل کی اس زیر تبصرہ کتاب میں مضمون آفرینی اور فکر ومعنی کی سطح پر مابعد کا شعر اپنے ماقبل کے شعر سے مربوط اور Co-relate نظر آتا ہے۔مضمون آفرینی کے حوالے سے ربط وتسلسل تو ملتا ہی ہے ساتھ ہی اپنے تخلیقی جواز کا سامان بھی فراہم کرتا نظر آتا ہے، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جو سوالات قائم کئے گئے ہیں ان میں فکر وفلسفہ کی کارفرمائیوں کے فکری اور فنی التزام کو روا رکھا گیا ہے۔اب یہ دیکھئے ''شہرِ فطرت'' والے باب میں ''بہاریہ'' کے ذیلی عنوان کے تحت جو اشعار درج ہیں ان میں فطرت کی الوہی کرشمہ سازیوں کے تخلیقی اظہار کے ساتھ شاعر اپنی حیرت انگیزوں کا اظہار بھی کرتا ہے۔خیال رہے کہ یہ حیرت انگیزیاں متشکک تخلیقی صورت حال وضع نہیں کرتی ہیں، بلکہ یہ شاعر کا یقین واعتماد ہے ؎

سبزے کو مل ہی جاتی ہے کچھ نرم گرم دھوپ
پانی ہوا بغیر بھی پودا سوال ہے

بعد کے شعر میں اس کا جواب بھی ہے ؎

فطرت سے کچھ بعید نہیں ہے جہان میں
اس پر فقیہ وقت کا فتویٰ سوال ہے

یہ دونوں شعر مضمون آفرینی اور فکر و معنی کی سطح پر ایک دوسرے سے مربوط اور Co-relate ہیں۔ شاعر کا یہ ہیئتی تجربہ اختراع پردازی اور جدت طرازی کا تخلیقی عمل تو ہے ہی، ساتھ ہی اس قسم کے سوالیہ شعری بیانیوں میں شاعر کی فکری Curiosity کا بھی زبردست احساس ہوتا ہے۔

گزشتہ سطور میں خورشید اکبر کو خاکسار نے ایک تجسس پسند تخلیقی ذہن کا شاعر کہا ہے۔ میرے اس موقف کی توجیہ فکر و فن کے اسی نہج پر ہوتی ہے۔ یہاں یہ بھی عرض کرتا چلوں کہ اس طویل غزل کتاب میں جو ہیئتی تجربے سوالیہ شعری بیانیہ کی صورت میں کئے گئے ہیں، ان میں بھرتی کے اشعار نہ ہوں، ایسا ممکن نہیں ہے کیونکہ کسی بھی کام میں Pros and cons دونوں ہی پہلو ہو سکتے ہیں۔

طوالت کے پیش نظر ممکن ہے کہ شاعری کے بعض سنجیدہ قارئین کی یہ سمجھ ہو کہ خورشید اکبر زیر گفتگو غزل کتاب میں ایک قادرالکلام شاعر کی صورت میں نظر آتے ہیں، جب کہ واقعہ یہ ہے کہ خورشید اکبر قادرالکلام بھی ہیں اور قادرالبیان بھی، حالانکہ اس سے قبل کے مجموعوں میں ان کی قادرالکلامی دیکھنے کو نہیں ملتی ہے، لیکن قادرالبیانی تو فکر و فن کی سطح پر اوج کمال پر نظر آتی ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ بہت سارے استاد شاعر ایسے گزرے ہیں جو حد درجہ قادرالکلام واقع ہوئے ہیں۔ ان کے یہاں اگر چہ ۳۵۔۳۰ یا ۴۵۔۴۰ اشعار کی غزلیں ملتی ہیں، لیکن ان کی یہ غزلیں بے کیف و بے رنگ نظر آتی ہیں۔

خیال رہے کہ قادرالکلامی اور قادرالبیانی دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ قادرالبیانی کا تعلق علم بیان سے ہے۔ مطلب یہ کہ زبان کی جدلیاتی صورت گری (Dialective Form) کے فنی التزام کو ملحوظ رکھا جاتا ہے، تاکہ ترسیل فکر و فلسفہ تشبیہات و استعارات اور اشارات و کنایات کے راستے حد درجہ فصیح و بلیغ ہو سکے۔ تخلیقی فنکاری میں بالخصوص شاعری میں زبان اپنے لغوی معنی سے ہٹ کر وضعی دلالت کے فنکارانہ عمل سے گزرتی ہے۔ زبان کے باطنی مفاہیم و معانی کو فکر و فن کی سطح پر برتنا ہی اس کی جدلیاتی صورت گری (Dialactive Form) ہے۔ جہاں زبان معنوی اور وضعی سطح پر Creativity کی ایک دنیا آباد اور خلق کرتی ہے۔ میرؔ نے جب کہا ؎

کہا میں نے کتنا ہے گل کا ثبات
کلی نے یہ سن کر تبسم کیا

ظاہر ہے کہ ہمارے اور آپ کی طرح کلی تو مسکراتی نہیں، یہ تو کنایتاً تخلیقی گفتگو ہے۔ شعر کی زبان ایسی ہی ہوتی ہے، چنانچہ غنچہ کا پھوٹنا ہی پھول کی صورت پذیری کا سبب بنتا ہے اور پھر پنکھڑیوں کا بکھرنا ہی گل کا ثبات ہے۔ ''کتنا ہے گل کا ثبات؟'' اس کا انحصار تو بس کلی کی مسکراہٹ پر ہی موقوف ہے۔ یہ لطافت و نزاکت کی انتہا ہے۔ زندگی کی بے ثباتی کے موضوع پر میرؔ کے اس شعر سے بہتر کوئی اور شعر اردو شاعری میں خال خال ہی نظر آتا ہے۔ آپ نے دیکھا کہ شعر کیسے وجود میں آتا ہے اور اس کے ممکنہ تشکیلی عناصر کس قسم کی تخلیقی نوعیت کے ہوتے ہیں۔ ساتھ ہی قادرالبیانی کے حوالے سے اختیار کردہ موقف کی توجیہ فکر و سوچ کے اسی نہج پر ہوتی ہے۔ اس بحث کی روشنی میں ''چہرہ سوال ہے'' میں درج اس شعر پر غور فرمائیے ؎

شبنم گری چٹان کا سینہ دَرَک گیا
پھولوں کی طرح شاخ پہ کھلتا سوال ہے

شبنم کے گرنے سے چٹان کا سینہ درک جاتا ہے یعنی اس میں درار پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ ایک ایسا محیرالعقول شعری فینومنن ہے جس پر یقین کر بھی سکتے ہیں اور نہیں بھی، لیکن شاعری کی زبان ایسی ہی ہوتی ہے۔ جس میں شعری فنتاسی بعض موقعوں پر بعید از قیاس محسوس ہوتی ہے، لیکن شاعر کے تصور و تخیل کے اس پہلو پر غور فرمائیے کہ شبنم کی فطرت میں تو خنکی ہی خنکی ہوتی ہے اور اس کا وجود بھی لمحاتی ہوتا ہے۔ آفتاب کی پہلی کرن پڑتے ہی، اس کی تاب نہیں لا سکتی، لیکن ذرا اس قوت تصور و تخیل پر غور فرمائیے کہ آفتاب کی پہلی کرن کی گرمی اس کی Intensit of Heat کا سبب بنتی ہے۔ یہ بھی غور فرمائیے کہ شبنم کے گرنے سے چٹان کا ہی سینہ کیوں درک گیا۔ ممکن ہے کہ شبنم کی یہ خلاف فطرت وقوع پذیری ہی اس کی تندی و تیزی اور شدت انگیزی کا سبب بن گئی ہو، وجہ جو بھی ہو، لیکن مصرع ثانی میں شبنم کی فطری معقولیت پسندی دیکھنے کو ملتی ہے۔ شبنم اپنی تندی و تیزی اور شدت انگیزی کی اس خلاف فطرت صورت حال سے آزاد ہوتی نظر آتی ہے اور پھول کی پنکھڑیوں کے لئے خنکی و سیرابی کا سبب بنتی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہی تو اس کی فطرت ہے۔ پھول کی پنکھڑی ہو یا

ہریالی وسبزہ شبنم کی اس فطری آماجگاہ میں ہی اس کی نمو پذیری ہوتی ہے۔

مذکورہ شعر کا Focus Point شبنم کا تخلیقی وقوعہ ہی ہے، جس کے مضمرات واثرات کے کیف وکم کو شاعر نے اپنی تخلیق کا حصہ بنایا ہے، حالانکہ شعر کی حد درجہ مبہم پسندی ترسیل فکر وفلسفہ کے راستے میں حائل ہوتی نظر آتی ہے، پھر بھی مذکورہ شعر کو قادرالبیانی اور جدلیات کے فنکارانہ برتاؤ کی صورت میں دیکھا جانا چاہئے۔

مثالیں اور بھی دی جاسکتی ہیں، لیکن مجھ میں اب مزید تاب نگارش نہیں ہے۔ شبنم کے حوالے سے ثاقب بنارسی کے اس شعر کے ساتھ اس گفتگو کو یہیں پر ختم کیا چاہتا ہوں ؎

گئے وہ لمحے کہ پہلی کرن کی تاب نہ تھی
اب آفتاب سے اونچا مقام شبنم ہے

مقام شبنم کا آفتاب سے اونچا ہونا ہمارے سامنے غور وفکر کے کئی دروازے کھولتا نظر آتا ہے۔

دیگر اصناف کے ساتھ شاعر نے اپنی اس غزل کتاب کو رزمیہ بھی کہا ہے۔ ظاہر ہے کہ رزمیہ کا تعلق اس کی بیانیاتی تکنیک (Art of Narrative) سے ہے۔ میرے نزدیک یہ غزل کتاب ایک Micro Narrative کی صورت میں دکھائی پڑتی ہے۔ مہابیانیہ (Meta Narrative) طویل ترین رزمیہ (Longest Epic) کو ہی کہتے ہیں۔ یہ بھی عرض کرتا چلوں کہ رزمیاتی بیانیہ کے فریم کو تیار کرنے کے لئے شاعر کو اپنے فنی اور شعری لوازم پر بے حد عبور اور دسترس حاصل کرنے کی ضرورت ہے۔ ذرا سی لڑکھڑاہٹ شیشہ فن کو چکنا چور کرسکتی ہے۔ ممکن ہے کہ آپ کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو رہا ہو کہ آخر Narrative کے کیا معنی ہیں۔ اس سلسلے میں یہ نکتہ گوش گزار کرتا چلوں کہ آپ اپنی فکر وسوچ کا تخلیقی اظہار کس نہج سے کرتے ہیں اور کس قسم کے بیانیہ کا فریم تیار کرتے ہیں، اسی میں بیانیہ (Narrative) کے تشکیلی عناصر کے راز مضمر ہیں۔ بیانیہ کے تشکیلی عناصر رزمیہ، مدحیہ اور قصیدہ کسی بھی صورت میں ہوسکتے ہیں، لیکن خیال رہے کہ سبھوں کے تشکیلی عناصر اور ان کی تخلیقی نوعیتیں جدا جدا ہوتی ہیں۔

ادب کے ساتھ دوسرے شعبوں میں بھی Narrative سے کام لیا جاتا ہے۔ مثلاً جنگ کی اپنی ایک حکمت عملی (Strategy) ہوتی ہے۔ یہ Proxy War یا Propaganda War کسی بھی صورت میں ہوسکتی ہے، حالانکہ اسلحوں کا مظاہرہ جنگ کی بنیادی ضرورت ہے۔ عرض یہ کرنا ہے جنگ ہو یا کوئی اور دوسرے معاملات ومسائل ہوں، اُن میں نفسیاتی فضا سازی اور دباؤ کے لئے جس قسم کی حکمت عملی کی ضرورت پڑتی ہے اس کے لئے Narrative بنایا جاتا ہے۔ مطلب یہ کہ حکمت عملی ہی وہ بنیادی Tool ہے جو Narrative کی تشکیل میں کلیدی رول ادا کرتی ہے۔ یہی معاملہ افسانہ اور ناول کے ساتھ بھی ہے۔ افسانہ نگار بیانیہ کے لئے کس قسم کا فریم تیار کرتا ہے اور اس میں اثر انگیزی کی قوت وصلاحیت کس حد تک ہے اسی میں ایک کامیاب Narrative کے راز مضمر ہیں۔ آیا افسانہ نگار نے Place Value پر توجہ مرکوز رکھی ہے یا پھر Space Value پر۔ خیال رہے کہ گلوبل تخلیقی منظر نامہ کا تعلق Space سے ہے، جب کہ مقامیت کی رنگ آمیزی کا تعلق Place سے ہے۔ یہ بحث طویل ہوسکتی ہے جس کا یہاں موقع نہیں ہے۔

شاعر خورشید اکبر نے اپنی اس غزل کتاب میں تخلیق کی ان فنی نزاکتوں اور لطافتوں کو ملحوظ رکھا ہے۔ اردو کے شعری ادب میں اس کتاب کا استقبال کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ اردو کے ادبی حلقے میں اس کی خاطر خواہ پذیرائی ہوگی۔

نام کتاب	:	یادوں کے چراغ
مصنف	:	اکبر رضا جمشید
ناشر	:	اکبر رضا جمشید اردو ادب ایوارڈ کمیٹی، پٹنہ
اشاعت	:	۲۰۲۴ء صفحات : ۱۱۲
قیمت	:	۲۰۰ روپے
مبصرہ	:	رابعہ خاتون

تاریخ انسانیت کا حافظہ ہے اور یادیں انسان کا عظیم سرمایہ۔ ماضی کی یادیں انسان کی فطرت میں داخل ہیں۔ بیشک ماضی لوٹ کر نہیں آتا ہے، مگر اُس کی یادیں کسی نہ کسی شکل میں ضرور لوٹتی ہیں۔ مذہبی رُخ سے دیکھا جائے تو یادوں کا رشتہ دراصل جذبہ شکر کے اظہار سے ہے یا پھر

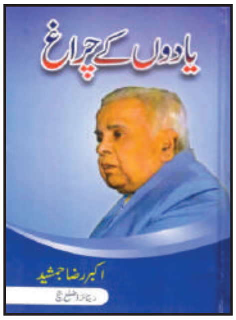

جذبہ صبر کے اظہار سے۔ نفسیاتی اور ظاہری جہتوں سے انسانی یادوں کی کائنات چاہے کتنے ہی حصوں میں کیوں نہ بٹتی چلی جائے، لیکن بندۂ مومن کے لئے مایوسی کفر ہے، اس لئے اُس کی یادیں جب کبھی یکجا ہوتیں اور صفحہ قرطاس پر آتی ہیں تو وہ فرد یا معاشرے کو کسی اندھیرے غار کی طرف نہیں لے جاتی ہیں، بلکہ اُس جہانِ فکر و عمل میں لے آتی ہیں جہاں ہر طرف روشنی ہی روشنی ہوتی ہے۔ ادبی نقطہ نظر سے یادنگاری ایک عظیم فن ہے اور اس کا بنیادی تقاضہ یہ ہے کہ قلم کو خودستائی، فضیلت فروشی، تملق گری اور مرعوبیت سے بچائے رکھا جائے۔

یہاں مذکورہ باتیں دراصل ''یادوں کے چراغ'' نامی اُس کتاب کے تناظر میں لکھی جارہی ہیں جو اِس وقت میرے مطالعہ کی میز پر ہے اور جس کے مصنف کا نام نامی ہے اکبر رضا جمشید، جو بحیثیت ضلع جج اپنی منصبی ذمہ داریوں سے فراغت کے بعد خصوصیت سے تصنیف و تالیف کے کاموں میں لگے ہوئے ہیں۔ ''نے ناشنیدہ غالبؔ'' سے لے کر ''حیات امیرالمومنین حضرت علی ابن ابوطالب'' تک اُن کی بارہ کتابیں شائع ہوچکی ہیں جن میں ڈرامے کی کئی کتابیں بھی شامل ہیں اور اب اُن کی تازہ کتاب ''یادوں کے چراغ'' منظر عام پر آئی ہے جو ''پیش لفظ'' کے بعد بائیس عناوین سے یا یوں کہیں کہ بشمول ذکر خویش بائیس عظیم شخصیات کی یادوں سے مزین ہے۔

اس کتاب کے ''انتساب'' سے جہاں والدین، برادران و خواہر یعنی سات مرحومین کی یادیں چشم نم کے ساتھ تازہ کی گئی ہیں، وہیں ''پیش لفظ'' میں مصنف نے ایک طرف اپنے آبائی گاؤں کی اُس غیر مسلم ضعیفہ کو یاد کیا ہے جو اپنے پانچ سالہ نواسے کے ساتھ گول مٹول لوٹے میں پانی لئے، دسویں محرم کو اُس جگہ کھڑی تھی جہاں سامنے سے تعزیہ آرہا تھا اور دوسری طرف سہسرام کے اُن دنوں کے ہندو مسلم فساد کو یاد کیا ہے، جو وہاں اُس کی پوسٹنگ کے دوران ہوا تھا اور کہنے کی ضرورت نہیں کہ یہاں یہ دونوں یادیں جمع کر دینے کا پیامی مقصد کیا ہے؟

''پیش لفظ'' کے بعد یہاں یادوں کا سلسلہ جن شخصیتوں سے وابستگی رکھتا ہے اُن میں ایک طرف علامہ جمیلؔ مظہری، غلام سرور، عابد رضا بیدار اور دلیپ کمار جیسے شاعر، صحافی، دانشور اور فلمی اداکار ہیں تو دوسری طرف صدر جمہوریہ فخرالدین علی احمد، گورنر بہار یونس سلیم، شفیع قریشی، موجودہ وزیراعلیٰ بہار نتیش کمار۔ اتنا ہی نہیں بلکہ اُن شخصیتوں میں مولانا سید کلب عابد، مولانا محمد حجت، مولانا ظفر عباس، مولانا سید محمد محسن اور مولانا وصی حسن خاں جیسے علمائے کرام بھی شامل ہیں اور وکالت و عدالت کی دنیا سے تعلق رکھنے والے سید شاہ اصغر حسین، جسٹس سید سرور علی، جسٹس علی احمد، جسٹس نند لال اونٹوالیہ، جسٹس للت موہن مشرا، جسٹس آفتاب عالم، جسٹس سید نیر حسین، جسٹس اقبال احمد انصاری جیسے مشاہیر و ماہرین بھی اور پھر آخر میں ''جانے کیا تو نے کہی، جانے کیا میں نے سنی'' کے عنوان سے خود مصنف نے اپنا یادبداماں تذکرہ بھی کیا ہے۔

یہ کتاب مصنف کی نوع بنوع یادوں پر مشتمل ہے اور ظاہر ہے کہ یادوں کی واقعاتی تفصیل، قاری سے یادخوانی کا لطف چھین لیتی ہے، اس لئے اس مختصر سے تبصرے میں اس سے اجتناب ہی بہتر ہے، البتہ مجموعی تاثر کے طور پر یہ لکھنا ہرگز نہ مناسب نہیں کہ اس کتاب میں ملاقاتوں، مجلسوں اور ادبی محفلوں کی جو بھی یادیں ہیں، وہ بہت اہم، قیمتی اور ذہن ساز ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ ان یادوں سے گزرتے ہوئے ایک آدھ مقام پر مصنف کا قلم ذرا سا خودستائی کے کانٹوں میں بھی اُلجھ گیا ہے، لیکن شخصیات کی سوانحی جھلکیاں، سیرت و کردار اور معمولات کے ذکر، ان کی اعلیٰ ظرفی و بلند نظری، عقیدے و نظریے کی عکاسی بہرصورت یہاں پوری طرح کامیاب ہے۔ کمرۂ عدالت کی بحث، مقدمات کی سرگزشت، فیصلے میں حفظ ماتقدم کا خیال، علمی و مجلسی گفتگو کا خلاصہ، بعض علمی تقاریب کی روئیداد، غرض کہ مطالعہ و استفادہ اور دلچسپی و ذہن کشائی کا نوع بنوع سامان یہاں مہیا ہے۔ ایک بہت ہی خاص بات یہ بھی ہے کہ مصنف نے علمائے کرام اور دیگر شخصیات کے خطابات و تقاریر کا پورا متن اور اجرائے کتب کے پروگرام کی روئیداد بہت ہی توجہ اور ذمہ داری سے اس کتاب میں لا دیا ہے۔ یہاں قومی اتحاد، رواداری پر توجہ دلانے کا ایک واضح مقصدی شعور ہے جو پوری کتاب میں زیریں لہر کی طرح رواں دواں ہے۔

مصنف کے اسلوب میں ہمہ جا سادگی، سنجیدگی، پرکاری، حقیقت پسندی، عصری واصلاحی شعور اور خاموش پیامی رنگ صاف صاف دیکھا جاسکتا ہے۔ یہاں مصنف نے اپنی زندگی کے ہر ایک پن سے وابستہ یادیں خودنوشت تعارفی انداز میں یکجا کردی ہیں۔ اس طرح سچ یہی ہے کہ جگہ جگہ یادِ معصومین کے صدقے گویا اس ''یادوں کے چراغ'' کی روشنی میں خود مصنف کی شخصیت بھی چمک اُٹھی ہے اور متعلقہ شخصیات کے گوناگوں جلوے بھی صاف صاف دکھائی دینے لگے ہیں۔

مصنف کی ان یادوں میں خاکہ نگاری کی جھلک بھی ہے، تہذیبی مناظر بھی اور اظہار حقائق بھی۔ یہ یادیں کئی دہائیوں کا سرمایہ ہیں، ان میں ذاتی شوق وشغف کی رمق بھی ہے، تصنیفی زندگی کی بالواسطہ عکاسی بھی اور بار بار احسان شناسی کے جذبے کا اظہار بھی۔ یہ کتاب مجموعی طور پر اس بات کا ثبوت ہے کہ اس کا مصنف یادوں کے ہضم وانتخاب کی صلاحیت بھی رکھتا ہے اور اُن کی مقصدی پیش کش کا ہنر بھی جانتا ہے۔

یہاں اکبر رضا جمشید نے حتی الوسع کامیابی کے ساتھ یادنگاری میں خودستائی یا تملق گری سے دامن بچا رکھا ہے اور بہت ہی خوبصورت، سنجیدہ اور موثر طریقے سے سدا بہار ونفع بخش یادوں میں قاری کو حصہ دار بنایا ہے۔

کتاب کے آخر میں رنگین تصویری اوراق زبان حال سے مصنف کی زندگی اور سرگرمی کی کہانیاں سناتے ہیں تو اندرونی سرا وراق و پس اوراق پر اکبر رضا جمشید اردو زبان و ادب ایوارڈ یافتگان کی جو تصویریں دی گئی ہیں وہ گویا معاصر قلم کاروں کا ایک یادگار رنگین البم ہے یہ اور بات ہے کہ اسے دیکھ کر اس احساس سے بار بار آنکھیں نم ہو چلیں کہ اب ان میں سے کئی صورتیں خاک میں پنہاں ہو چکی ہیں۔ بہرکیف! ''یادوں کے چراغ'' اپنے مصنف کے تجرباتی، مشاہداتی اور وکالت کی زندگی سے وابستہ واقعات کا ایک ایسا یادنامہ ہے جو یقیناً اپنے پڑھنے والوں کو مسرت وبصیرت اور خاص طور سے ملک عزیز میں فی زمانہ قومی یک جہتی کی ضرورت کا ذہن دیتا رہے گا اور اس حوالے سے اپنی اہمیت کا ہمیشہ احساس بھی دلاتا رہے گا۔ ❁❁

کہانی کی کامیابی کے لئے......

ادب کے کچھ اصناف بڑی آسانی سے ضابطوں میں قید کئے جاسکتے ہیں اور ان کی پہچان ہی نہیں، پرکھ بھی ان اصولوں اور ضابطوں کی روشنی میں کی جاسکتی ہے، لیکن افسانوی ادب اس زمرے میں نہیں آتا کیونکہ نہ تو اس کے موضوعات معین ہیں اور نہ اظہار کے طریقے۔ زندگی شکل بدل بدل کر اپنی کہانی دہراتی رہتی ہے، اس لئے ہر زمانہ اسے نئے انداز میں کہتا اور نئے انداز میں سنتا ہے۔ کہانی کا عام قاری فن کا علیحدہ سے احساس نہیں کرتا، فن کی خوبی یہی ہے کہ اس نے مواد اور مسالے کو بنا سنوار کر اس طرح پیش کردیا گیا ہو کہ قاری اس کے جادو میں گرفتار ہوجائے۔ کہانی کیا ہے اور کیسے کہی گئی ہے، بس کی بحث اس تاثر سے الگ شروع ہوتی ہے جو مجموعی طور پر سننے یا پڑھنے والا قبول کرتا ہے۔ کہانی کی کامیابی یک طرفہ بھی نہیں ہوتی۔ یعنی محض لکھنے والے کا شعور فن اور شعور حیات اس کی کامیابی کا ضامن نہیں ہے، پڑھنے والے کی کامیاب شرکت بھی ضروری ہے، اس لئے بعض کہانیاں ایک شخص کو اچھی معلوم ہوتی ہیں بعض دوسرے کو، کیونکہ تاثر کی قبولیت بھی افراد کے مطالعے، مشاہدے اور تجربے کی تابع ہوتی ہے۔ افسانہ نگار کے تجربے اور مشاہدے کا دائرہ جتنا ہی وسیع ہوگا اتنا ہی قاری اس کے افسانوں سے لطف اندوز ہوسکے گا۔ اس سلسلہ میں یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ اس تاثر میں اضافہ کرنے کے لئے افسانہ نویس اظہار کے مختلف تجربے کرتا رہتا ہے، اگرچہ بنیادی بات باقی رہتی ہے یعنی افسانہ زندگی کا کوئی نقش ہر حال میں ہوتا ہے، چاہے اُسے کسی انداز میں پیش کیا جائے۔ نئی شاعری کی طرح نئی افسانہ نگاری بھی تلاش اظہار میں زبان وبیان کے مسلسل تجربے کررہی ہے اور ہر لکھنے والا چاہتا ہے کہ اپنی بات اپنے ہی ڈھنگ سے کہے۔ اس بات کا حق ہر تخلیقی فن کار کو حاصل ہے، صرف اسے اس کا خیال رکھنا پڑے گا کہ وہ اظہار کی معنویت اور رسائی کا خیال بھی رکھے۔ (ولایت علی کے افسانوی مجموعہ ''سورج کی صلیب''، مطبوعہ الہ آباد، اگست ۱۹۶۲ء کے مقدمہ بقلم پروفیسر سید احتشام حسین بہ عنوان ''تعارف''، ص ۵ وص ۶ سے ماخوذ)

☆ ''زبان وادب''، مئی ۲۰۲۵ء موصول ہوا۔ سابقہ شماروں کی طرح اپنی تزئین اور ترتیب و زیبائش میں یہ شمارہ بھی بہت خوب ہے۔ مولانا حسرتؔ موہانی کی تصویر اور عکس تحریر سے سرورق کو دستاویزی حیثیت مل رہی ہے اور شوکت تھانوی کی تصویر اور ''تبسم'' کی طرف اپنے نام کی اضافت رکھنے والی ان کی کتابوں کے عکس سے رسالے کا پس ورق اپنی معنویت دکھا رہا ہے تو اندرونی سرورق و پس ورق پر سوانحی کوائف و تصاویر کے ساتھ بالترتیب ظفر عدیمؔ اور بیناؔ نقوی کی غزلیں بھی اپنی اپنی بہاریں دکھانے میں کچھ کم نہیں۔ اس قدر محنت اور توجہ سے شمارے کی تیاری کے لئے آپ کے جذبے کو سلام۔ رسالہ کا اداریہ مشمولات کے باب میں اپنی کامیاب تعارفی روش پر پوری طرح قائم ہے اور حسب سابق حسن تحریر کا آئینہ دار۔ اس شمارے میں آپ نے دو دو ناموں سے کالم بنا کر اُن مرحومین کو یاد کیا ہے، جو ماہ مئی سے اپنی ولادت یا وفات کی نسبت رکھنے والے ہیں۔ یہ طریقہ ایک مناسب طریقہ محسوس ہوا۔ ''مولانا حسرتؔ موہانی پر ''حسرتؔ و شوکت'' کے تحت جناب محمد پرویز اختر کا مقالہ ایک نہیں کئی لحاظ سے متوجہ کر گیا، اس میں جامعیت بھی ہے اور موضوع و مطالعہ کی ندرت بھی۔ اسی طرح محترمہ پروین اشرفی کا مقالہ بھی شوکت تھانوی کی حیات و خدمات اور ان کی تصنیفی تبسم آرائی دکھانے میں کامیاب نظر

آیا۔ ''عطا و شبر'' کا کالم قائم کر کے آپ نے دو مقالے شامل کیا ہے۔ یہاں ایک طرف مرحوم ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی ''شبر امام کی عطا اللہ پالوی شناسی'' پر لکھنے کا حق ادا کرتے دکھائی دے رہے ہیں تو دوسری طرف جناب ایم۔ احمد توصیف بھی ''پالی کے دو رتن'' کو سامنے لا دینے میں ہر لحاظ سے کامراں ہیں۔ واقعی عطاء اللہ پالوی اور شبر امام کو صرف پالی ہی کیا، بہار کی دھرتی سے اُٹھنے والے فن کاروں کے تذکرے میں کبھی بھلایا نہیں جا سکے گا۔ رہی بات ادبی شخصیت کشی کے رجحان کی تو وہ بس ایک طلسم ہی ہوتا ہے جو دیر یا سویر ٹوٹ ہی جاتا ہے۔ یہ دونوں مقالے سوانحی معلومات سے بھرپور ہیں اور احتسابی رُخ سے اسلاف شناسی کے لئے خاموش، مگر تازہ و موثر دعوتِ فکر بھی دے جاتے ہیں۔ ''پرویزؔ وانجم'' کے تحت بھی دونوں ہی مقالے لائق مطالعہ اور لائق استفادہ ہیں۔ ڈاکٹر سید اشہد کریم نے ''پرویزؔ شاہدی کی غزل گوئی'' پر گہرائی سے اور کچھ خاص وژن کے ساتھ نظر ڈالی ہے اور موثر و مفید نکات پیش کرنے میں کامیاب رہے ہیں تو جناب ساحرؔ داؤدنگری کا اختصاص یہ ہے کہ انہوں نے ''حامد الانصاری انجمؔ'' کی شخصیت و شاعری پر اساسی مواد کے ساتھ قلم اٹھایا ہے۔ یہ مقالہ اس لئے بھی لائق مطالعہ ٹھہرتا ہے کہ میری معلومات کے بموجب حضرت انجمؔ پر نسبتاً کم کم ہی لکھا گیا ہے اور ظاہر ہے کہ ایسے موضوعات پر جو عدم التفات کی نذر ہو رہے ہوں، ترجیحی توجہ دینا ہر لحاظ سے ستائشی عمل ہی کہا جائے گا۔ ''مقالات'' کے صفحات بھی یقیناً پُر ارزش ہیں۔ ناصر علی سرہندی اور ان کے ممیّزات سخن'' پر ڈاکٹر صابر علی سیوانی نے محنت سے اپنے مطالعہ کی خاطر مواد جمع کیا ہے اور اسے ایک علمی سوغات کی شکل میں ہمیں دیا ہے۔ یہ ایک مدلل مقالہ ہے جو فارسی ادب و شاعری خصوصاً دور ہندویہ کے فن کاروں پر مطالعہ میں خاص فائدہ دے گا۔ ''فیض احمد فیضؔ کی مزاحمتی شاعری'' پر ڈاکٹر محمد مجاہد حسین بھی موضوع کا حق ادا کرنے میں ناکام نہیں اور یقیناً ممتحنہ اختر نے ''ترقی پسند اردو تنقید میں موضوع و مواد کی تقسیم کا مسئلہ'' اٹھایا ہے تو اس کے کسی ضروری گوشے کو حتی الامکان تشنہ بھی نہیں چھوڑا ہے۔

(ڈاکٹر) درخشاں جمیل، پٹنہ

☆ مئی ۲۰۲۵ء کا ''زبان ادب'' ملا، شکریہ! ادھر کچھ دنوں سے رسالے کے تازہ شمارے دیر دیر سے پہنچنے لگے ہیں، مگر اس میں دو رائے نہیں کہ یہ جب بھی پہنچ جائیں، ان کے سرورق کا دیدار اور ان کے مشمولات کا مطالعہ انتظار کی ساری کوفت دور کر دیتا ہے۔ مئی کا شمارہ پا کر اور پڑھ کر بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ آپ نے رسالے کے بیرونی اور اندرونی سر اوراق کو حسن اور علمی معنویت کا حامل بنانے میں جو محنت اور توجہ صرف کی ہے، اس کا جواب نہیں۔ حسرتؔ پر ڈاک ٹکٹ کا عکس، حسرت کی تحریر کا عکس پھر شوکت تھانوی کی تصویر، ان کی کتابوں کے سرورق کا عکس، اندرونی حصہ میں ظفر عدیمؔ اور میناؔ نقوی کی تصویریں، غزلیں اور دونوں کے مختصر، مگر جامع احوال زندگانی، ایسے لعل و گہر صرف چار صفحوں میں جمع کر دینا یقینی طور سے انتہائی قابل تعریف کہا جائے گا، پھر اس شمارے میں مولانا حسرتؔ موہانی، شوکت تھانوی، عطاءاللہ پالوی، شبر امام، پرویزؔ شاہدی اور حامد الانصاری انجم پر جو مضامین شامل اشاعت ہیں ان کی وقعت سے بھی انکار نہیں ہوسکتا۔ ان تمام شخصیتوں پر لکھنے والوں نے سچ مچ مطالعہ میں ڈوب کر لکھا ہے۔ اس شمارے کے ''مقالات'' میں ڈاکٹر صابر علی سیوانی کی وہ کاوش خاص طور سے متوجہ کر گئی جس میں ناصر علی سرہندی کو یاد کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر نریش نے اپنی کہانی میں جو ''تصادم'' دکھایا ہے اس کے لئے آپ کے اداریہ کا لفظ مستعار لے لوں تو کہہ سکتا ہوں کہ ''ذہنی و نفسیاتی'' لحاظ سے وہ سچ مچ ''دیدنی'' ہے۔ جہاں تک ارشد منیم کی کہانی ''مدعا'' کا معاملہ ہے، سچ کہوں کہ یہ بڑے ہی غضب کی کہانی ہے، کہانی کی آخری چار سطریں کیا ہیں، ایسا لگتا ہے جیسے شردھا کی بات سے ایک بم پھٹ گیا ہو۔ ''منظومات'' کے تحت افسر جمال افسرؔ کی ''نعت پاک''، سلطان احمد ساحلؔ کی نظم ''بے سمت رفتار زندگی'' کے کیا کہنے۔ واقعی سمت کھو جائے تو فرار کیا، پلٹنا بھی مشکل ہے۔ غزلوں میں نفیسؔ خیرآبادی، مناظر حسن شاہینؔ، سائرہ عظیمؔ، ڈاکٹر فرحت حسین خوشدلؔ نے خصوصاً متاثر کیا۔ صدام غنی، سعیدؔ نقشبندی، ڈاکٹر محمد زاہد اور شکیل ہاشمیؔ کی کاوشیں بھی اچھی اور متوجہ کر لینے والی ہیں۔ سریندر دیول کی کتاب ''انسانیت اور محبت کا شاعر: ساحرؔ لدھیانوی''، پر جس کا ترجمہ استوتی اگروال نے کیا ہے، خالد عبادی کا تبصرہ بہت متوازن ہے اور سید نفیسؔ دسنوی کے شعری مجموعہ ''افکار نو بہ نو'' پر ڈاکٹر رفیق احمد کا تبصرہ بھی یہی خوبی رکھتا ہے۔ ''سلام پیام'' کے حصہ میں متعلقہ شمارے کے سرورق کے عکوس کا شامل ہونا یہ بھی پسندیدہ بات ہے۔

محمد خرم نوازشؔ، نئی دہلی

☆ مئی ۲۰۲۵ء کا ''زبان وادب'' پچھلے ہفتہ ملا۔ پرچے کا خاص حصہ جو بچوں کے لئے ہوتا ہے، پچھلی بار کی طرح بلکہ اس سے ذرا بڑھ کر اس بار بھی بہت شاندار ہے، شاندار اس لئے کہ اس بار اس حصہ میں سب سے پہلے ''امرود والی اماں'' سے ملاقات ہوئی۔ یہ بہترین کہانی آنٹی ذکیہ مشہدی نے لکھی ہے۔ وہ عام طور سے بڑوں کے لئے کہانیاں لکھا کرتی ہیں، مگر جی خوش ہو گیا کہ انہوں نے ہم بچوں کو بھی یاد رکھا اور ہمارے لئے یہ کہانی لکھا ہے۔ کہانی دلچسپ اور بہت مزیدار ہے۔ اس کہانی میں کئی موڑ آئے ہیں اور لگ بھگ ہر موڑ پر باتوں ہی باتوں میں کچھ نہ کچھ سیکھ دی گئی ہے۔ قصہ کہیں یا پلاٹ وہ تو اپنی جگہ دلچسپ ہے ہی، اسی کے ساتھ ساتھ کہانی کے سبھی کردار بچوں کی سرگرمی سے جڑے ہوئے ہیں۔ صاف لگتا ہے کہ تعلیم کے ماحول اور ایک بوڑھی ماں کے آنچل کے سائے میں کہانی آگے کی طرف رہی ہے اور بچوں کی فطری شرارت اور ان کا تجسس بھی بحال ہے۔ کہانی میں کہیں یہ بتایا جا رہا ہے کہ بھوت، بس آدمی کا وہم ہے، کہیں امرود والی اماں، بچوں کو پھل دیتے ہوئے بتا رہی ہیں کہ ''بیٹا چڑیوں کے کاٹے ہوئے پھل نہیں کھانے چاہئیں'' اور کہیں امجد کی دادی سکھا رہی ہیں کہ بڑوں کو کس طرح ادب و عزت کے نام سے یاد کرنا چاہئے۔ اس کہانی میں خوبصورت فطری منظر بھی ہے کہ اسے پڑھ کر، بس اسے دیکھنے کو دل مچلنے لگے اور بڑوں کی ہدایت بھی کہ پابندی سے اسکول کرنے کا دھیان ادھر اُدھر نہ ہٹے، ساتھ ہی ساتھ بچوں کے لئے ہوشیاری کا پیغام بھی اور امرود والی

غریب بوڑھی عورت کو اپنا ٹفن کا کھانا دینے کے حوالے سے ان کی حوصلہ افزائی بھی۔ اس کہانی میں امرود والی اماں کا ایک جملہ آیا ہے ''ایسا کھانا کھائے ایک زمانہ ہوا بیٹا'' یہ جملہ بچوں کو کیا، بڑوں کو بھی غربت کی زندگی کا احساس دلا جائے گا، مگر پھر بھی امرود والی اماں کی فراخدلی اور ممتا بھری محبت کو سلام اور اُن بچوں کو بھی جو اُن کی غریبی دیکھ کر تڑپ اٹھے۔ اگر اکثر اس طرح کی کہانیاں پڑھنے کو ملیں تو کتنا مزہ آتا رہے۔ ''بچوں کا زبان وادب'' اس بار کہانی سے شروع ہو کر کہانی ہی پر ختم ہوا ہے۔ محترمہ فوزیہ کوثر نے ''ارادے اور آرزو کی برکت'' میں عاصم کا جو کردار دکھایا ہے اور اس کا اثر جس طرح اس کے بھائی فرحان کی سوچ پر پڑا ہے، اس میں بھی بڑا پیغام ہے اور شاید اسی کو فوزیہ صاحبہ نے ''ارادے اور آرزو کی برکت'' کا عنوان دیا ہے۔ اسی صفحہ پر ''سنہری باتیں'' بھی ہیں اور ان میں ایک ایک بات ایسی ہے کہ سدا یاد رکھی جائے تو زندگی سنورتی رہے گی۔ اس پرچے میں ثنا ثمرین صاحبہ کا مضمون ''املا اور املا'' بھی پڑھا اور اس سے تحریر اور گرامر کی بہت سی باتیں سیکھنے اور بہت ساری باریکیاں سمیٹنے کا موقع ملا۔ مضمون ذرا گاڑھا ہے اور ذرا غور سے پڑھنے کا مطالبہ کرتا ہے، مگر قواعدی معلومات کے لئے بہت کارآمد ہے اور حروف شناسی میں بھی مددگار۔ محترمہ انصاری شاذیہ صدف کی نظم ''میری ماں'' بھی بہت پسند آئی اور ''حواس خمسہ'' کے عنوان سے جناب حسن آتش چاپدانوی کی نظم بھی بہت کامیاب ہے۔

شاہین کوثر، سہرسہ

☆ ''زبان وادب'' اپریل ۲۰۲۵ کا شمارہ موصول ہوا۔ شکریہ! اس شمارے کی تمام تخلیقات معیاری ہیں۔ سرورق پر شکیل بدایونی پر ڈاک ٹکٹ کی تصویر اس بات کی نشان دہی کرتی ہے کہ آج بھی اردو ادب میں ان کی شہرت سلامت ہے۔ زیبا پروین کا مضمون ''شکیل بدایونی کی شاعری: چند نکات'' سے مرحوم کی حیات اور کارنامے کے کئی گوشے اُجاگر ہوتے ہیں۔ مقالہ ''۲۰۲۴ء کے خوبصورت افسانوی مجموعے'' میں پروفیسر اسلم جمشید پوری نے اُنیس افسانہ نگاروں کے افسانوی مجموعے پر ناقدانہ روشنی ڈالی ہے اور اس کے لئے یقیناً وہ مبارکباد کے مستحق ہیں۔ ڈاکٹر مسرت کا ''افسانہ، تعریف، فن، تکنیک اور اجزائے ترکیبی'' پڑھنے والوں کو افسانے کے فن اور تکنیک کے رموز سے واقف کراتا ہے۔ ڈاکٹر فتح عالم کا ''پھندنے: ایک تجزیاتی مطالعہ'' بھی قابل تعریف ہے، جس میں منٹو کی افسانہ نگاری کے کینوس اور اس کے رنگ برنگے شیڈس کو دکھانے کی سعی کی گئی ہے۔ ڈاکٹر سید صابر حسن، سلطان آزاد، ڈاکٹر محمد ثاقب انور اور طلحہ نعمت ندوی کے مضامین قارئین کے علم میں اضافہ کرتے ہیں۔ عظیم اقبال کا افسانہ ایک اچھا رومانی افسانہ ہے۔ اداریہ میں خاکسار کی کہانی پر آپ نے لکھا ہے کہ ''افسانہ 'سڑا ہوا ہاتھ' علاج ومعالجہ کی سہولیات کے لحاظ سے گاؤں کی غربت و پسماندگی کی ہی نہیں بلکہ ایک معذور انسان کی کیفیت اور بیوی کی محبت کے مناظر صاف صاف دکھا جاتا ہے۔'' افسانے کی اشاعت اور پھر اس پر آپ کی اِس ادارتی رائے کا بہت بہت شکریہ! نثار احمد صدیقی کا ڈرامہ ''بیٹا'' دل کو چھو لیتا ہے۔ ''منظومات'' میں اقصیٰ نوری کی مناجات، فردوس گیاوی، منور دانا پوری کی نظمیں بہت خوب ہیں اور مرغوب اثر فاطمی، نذر فاطمی، ڈاکٹر وصی الحق وصی، اوینا ش امن، طلحہ تابش، رہبر گیاوی اور جمال کاکوی کی غزلوں میں عصری حیثیت بہر کیف نمایاں ہے۔ ''بچوں کا زبان و ادب'' میں غلام محمد کا مضمون ''بابائے ہومیو پیتھ'' صبا پروین کی کہانی ''تقدیر کا کھیل'' اور ڈاکٹر بانو سرتاج کی کہانی ''مچھڑوں کی ہڈیاں'' بچوں اور نوجوانوں کو اپنی جانب متوجہ کرنے میں کامیاب ہیں۔

(ڈاکٹر) شاہد فروغی، ہوڑہ

خریداروں کے لئے ضروری اطلاع

☆ محکمہ ڈاک نے انڈر پوسٹنگ سرٹیفکیٹ سسٹم ختم کر دیا ہے، لہٰذا خریدار حضرات کو اب سادہ ڈاک سے رسالہ بھیجا جاتا ہے۔ رسالہ کی گمشدگی کے لئے ادارہ پر کسی طرح کی کوئی ذمہ داری اور باز پرس نہیں ہوگی۔

☆ اس دائرے میں سرخ نشان کا مطلب ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو چکی ہے۔ (سرکولیشن انچارج)

بچوں کا

زبان وادب

☆	خدا کی پناہ	حافظ تمنا پھلواری	۷۴
☆	نیک راستہ	ڈاکٹر منصور خوشتر	۷۴
☆	گوبر کی ٹوکری	صداقت علی	۷۵
☆	صابر کے ہم راہ خدا ہے	صبا نقوی	۷۶
☆	گرگٹ کی باتیں	جہانگیر انس	۷۷
☆	......جب دریائی گھوڑا دھاڑا	عائشہ رفعت	۷۸
☆	خیرات اور دان	رضوان احمد	۸۰

حافظ تمنّا پھلواری

"Tamanna Lodge" Sangi Masjid, Phulwarisharif
Patna - 801505 (Mob. 9931606459)

خدا کی پناہ

میں خوش ہوں کہ مجھ پر ہے رب کی نگاہ
دکھاتا وہی ہے سدا سیدھی راہ

بہت چاہا دنیا میں ابلیس نے
ہے شکر خدا کرسکا نہ تباہ

جو چھپ چھپ کے دن رات کرتا ہے تو
خدا سے چھپے گا نہ ناداں گناہ

کئے ہیں ہم نے دنیا میں جو خیر و شر
خود اپنے ہی اعضا بنیں گے گواہ

مسرت ملے یا ملیں رنج و غم
خدا کی رضا سے کریں ہم نباہ

دعا ہے یہ حافظؔ سبھوں کے لئے
ملے دو جہاں میں خدا کی پناہ

❁❁❁

ڈاکٹر منصور خوشتر

Editor "Darbhanga Times" Darbhanga - 846004
(Mob. 9234772764)

نیک راستہ

آؤ بچو! سناتا ہوں اک واقعہ
جرم اک ساتھی سے میرے سرزد ہوا
شاہد اس ساتھی کا میرے ، ہے نام بھی
آتا اسکول پیدل جو ہے روز ہی
اس کے گھر سے ہے دوری جو اسکول کی
پورا کرتا اسے ایک گھنٹے میں ہی
راستے میں جو تھا باغ امرود کا
توڑنے کو وہ اک پیڑ پر چڑھ گیا
ایک رکھوالا تھا بھی اُسی باغ کا
اس نے شاہد کو آکے پکڑ ہی لیا
ساتھ شاہد کے آیا وہ اسکول بھی
بات ساری پرنسپل سے اس نے کہی
جرم میں چوری کے اس نے پائی سزا
ہے براہی نتیجہ برے کام کا
ہم بری عادتوں سے رہیں دور بھی
ہے ا سی میں بھلائی ہماری بڑی
نیک ہی راستے پر چلا جو سدا
لیتی ہے اس کو منزل گلے سے لگا

❁❁❁

صداقت علی
Bhalessa Doda Jammu & Kashmir - 182203 (Mob.7006432002)

گوبر کی ٹوکری

جموں کے ایک دور افتادہ گاؤں میں ایک قبائلی لڑکا اپنے سر پر گوبر سے بھری ٹوکری رکھے کھیتوں کی طرف جاتا نظر آتا ہے۔اس کا نام اسلم ہے،اسلم کے گاؤں میں تعلیم گویا خواب جیسی چیز تھی اور زندگی کا دوسرا نام محنت تھا۔قبیلے کے سارے لوگ محنت کش تھے۔

اسلم کے والد اجمل ایک معمولی کسان تھے،جو دن بھر کھیتوں میں کام کرتے اور رات کو تھکے ہارے آکر ایک پرانی چارپائی پر بیٹھ کر بیڑی سلگاتے۔اسلم کی ماں شمیمہ، ہاتھ میں جھاڑو لیے کبھی گھر کے صحن میں کام کرتی اور کبھی چولہے کے پاس بیٹھ کر روٹی پکاتی،اس کے ساتھ ہی اسلم کی بہن رشیدہ تھی،جو چھوٹی تھی،مگر بڑی ذمہ دار تھی۔

گاؤں میں اسکول تو تھا،مگر غربت کے مارے زیادہ تر بچے پڑھائی چھوڑ کر کھیتوں میں مزدوری کیا کرتے تھے۔اسلم کے ہاتھ میں کتابوں کے بجائے گوبر کی ٹوکری ہوتی تھی، جسے وہ صبح سویرے کھیتوں تک لے جاتا،تاکہ جانوروں کا فضلہ کھاد میں تبدیل ہو سکے۔جب اسلم آٹھویں جماعت میں پہنچا تو اسکول کی فیس بھرنا مشکل ہو گیا۔وہ اسکول جاتا تو والدین کے ہاتھ تنگ پڑ جاتے اور اگر کام کرتا تو تعلیم چھوٹ جاتی۔آخر کار فیس نہ بھرنے کے باعث اسے اسکول چھوڑنا پڑا۔

ایک دن استاد رشید، جو گاؤں کے اسکول میں اردو پڑھاتے تھے،راستے سے گزر رہے تھے کہ انہوں نے اسلم کو سر پر گوبر کی ٹوکری اٹھائے دیکھا۔وہ رُک گئے اور اسلم کو غور سے دیکھتے رہے۔

پسینے سے شرابور اسلم جب کھیت کے کنارے پہنچا تو استاد نے اسے بڑی محبت سے پکارا:

''بیٹا تم اسکول کیوں نہیں آتے؟''

اسلم نے نظریں جھکا لیں۔وہ کیا کہتا؟ غربت کی زبان ہوتی تو شاید وہ سب کچھ بتا دیتی۔پھر ہچکچاتے ہوئے بولا:

''استاد جی،میرے پاس کتابوں کے پیسے نہیں ہیں،فیس نہیں بھر سکتا،اس لیے......''

استاد نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور مسکراتے ہوئے بولے:

''پیسوں کی فکر نہ کرو، بیٹا تم بس پڑھائی پر دھیان دو، خرچوں کی ذمہ داری میری۔''

استاد کے تعاون سے اسلم دوبارہ اسکول میں داخل ہو گیا۔

دن بھر کام،شام کو پڑھائی اور رات کو خواب،اس کا یہی معمول بن گیا۔اس نے دن رات محنت کی اور دسویں جماعت میں پورے ضلع میں پہلی پوزیشن حاصل کی۔یہ خبر دیکھتے دیکھتے جنگل کی آگ کی طرح پورے علاقے میں پھیل گئی۔

اب اس کے آگے ایک نیا امتحان تھا۔اس کا خواب ڈاکٹر بننے کا تھا،مگر میڈیکل کالج میں داخلے کے لیے پیسوں کی ضرورت تھی۔

استاد رشید نے پھر ایک بار اس کا ہاتھ تھاما اور گاؤں کے لوگوں سے چندہ جمع کیا۔سب نے اسلم کے جذبے کو دیکھا تھا لہٰذا سبھی اس کی مدد کے لیے تیار ہو گئے۔

کالج کی زندگی اسلم کے لیے آسان نہ تھی۔شہر کی چکا چوند، بڑی بڑی عمارتیں اور نئے چہرے،مگر وہ جانتا تھا کہ اگر ہمت ہار دی،تو گوبر کی ٹوکری دوبارہ اس کے مقدر میں آجائے گی۔

وقت گزرتا گیا اور اسلم نے ڈاکٹر بن کر اپنے گاؤں واپس آنے کا فیصلہ کیا۔وہ جانتا تھا کہ اس کے گاؤں کے لوگ پیسے نہ ہونے کی وجہ سے علاج نہیں کرا سکتے اس نے گاؤں میں ایک چھوٹا سا کلینک قائم کیا،جہاں وہ غریبوں کا مفت علاج کرتا تھا۔

ایک دن استاد رشید نے اس کی کلینک کا دورہ کیا۔اسلم دوڑ کر اُن کی قدم بوسی کو آگے بڑھا اور آنکھوں میں آنسو لیے بولا:

صباؔ نقوی

صابر کے ہم راہ خدا ہے

صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے
صبر سے سر اونچا ہوتا ہے
جبر کرے ، جابر کہلائے
صبر کرے ، صابر کہلائے
جس میں حلاوت کی خوبی ہے
صبر وہ ''صبر ایوبی'' ہے
صبر و رضا کے جو ہیں پیکر
اُن کے لئے ہے ، جنت و کوثر
صبر دعا کو حسن اثر دے
دردِ جگر کو ، درماں کر دے
صبر جہاں میں ردِّ بلا ہے
صابر کے ہم راہ خدا ہے
وقت مصیبت ، پیارے بچو!
صبر کا دامن ، ہاتھ میں رکھو
صبر سے سیکھیں ، اہل زمانہ
پتھر دل کو ، موم بنانا
چرخ ہے جس کا شاہد عینی
وہ ہے ، کمالِ صبر حسینی
حق کی مشیت ، صبر ہے گویا
قلب صباؔ ہے صبر کا جویا

(ماخوذاز''زبان وادب''ج ۳۳ش ا،ص ۷۹)

''استاد جی، اگر آپ نہ ہوتے تو میں آج بھی سر پر گوبر کی ٹوکری اٹھائے کھڑا ہوتا۔''

استاد کی آنکھیں نم ہوگئیں، مگر چہرے پر ایک سکون بھری مسکراہٹ تھی۔ انہوں نے آسمان کی طرف دیکھا اور جیسے دعا کی:

''اللہ کرے، ہر غریب اسلم بن سکے۔''

آج بھی اسلم کے گھر میں ایک پرانی گوبر کی ٹوکری پڑی ہے وہ اسے دیکھ کر اپنی ماضی کی مشکلات کو یاد کرتا ہے اور خود کو یہ باور کراتا ہے کہ محنت، ہمت اور استاد کی رہنمائی سے زندگی کے ہر امتحان کو جیتا جا سکتا ہے۔

یہ گوبر کی ٹوکری اس کے لیے غربت کی نہیں، بلکہ کامیابی کی علامت بن چکی تھی۔ اسلم کی کہانی ہمیں سکھاتی ہے کہ غربت کبھی بھی ترقی کی راہ میں رکاوٹ نہیں بن سکتی، اگر انسان کے اندر ہمت، عزم اور سیکھنے کا جذبہ ہو تو کامیابی اُسی کی ہے۔ اسلم کی کہانی ہمیں یہ بھی بتاتی ہے کہ ایک اچھا استاد نہ صرف علم دیتا ہے بلکہ خوابوں کو حقیقت میں بدلنے کا حوصلہ بھی دیتا ہے۔

گوبر کی ٹوکری اب صرف ایک چیز نہیں، بلکہ ایک تحریک ہے، جو یہ سکھاتی ہے کہ کوئی بھی کام چھوٹا یا بڑا نہیں ہوتا، بلکہ محنت ہی اصل عظمت ہے۔ زندگی کبھی کبھار ایسے امتحان لیتی ہے کہ انسان کی ہمت ٹوٹنے لگتی ہے، مگر کچھ لوگ مشکلات کے آگے جھکنے کے بجائے ان کا سامنا کرتے ہیں۔ یہ کہانی اس لڑکے کی کہانی ہے، جس کی غربت، محنت اور خوابوں کا سفر ''گوبر کی ٹوکری'' کے گرد گھومتا ہے۔

جہانگیرانس
At. Ranipur, P.o. Barharia, Dist - Siwan - 841232 (Mob. 9162357830)

گرگٹ کی باتیں

سرفراز کی عمر گیارہ سال ہے۔ کسی کی چاپلوسی کرنے اور اپنا مطلب نکالنے کے فن میں وہ ماہر ہے، جس سے اسے کچھ حاصل کرنا ہوتا ہے، اس کے آگے پیچھے گھومتا رہتا ہے اور مطلب نکل جانے کے بعد اس طرح لاتعلق ہو جاتا ہے جیسے کبھی کی جان پہچان ہی نہ ہو۔ دادی کہتی ہیں کہ وہ گرگٹ کی طرح رنگ بدلنے میں ماہر ہے۔

ایک دن دادی نے اسے کسی کام کے لئے کئی دفعہ آواز دی، مگر اس کے کان پر جوں کیا رینگتی، وہ تو گیم کھیلنے میں مگن تھا۔ دادی نے اس کے متعلق اپنا وہی پرانا محاورہ دہرایا کہ یہ لڑکا گرگٹ کی طرح رنگ بدلنے میں ماہر ہے۔ دادی کے قریب ہی سرفراز کی چھوٹی بہن سلمیٰ بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے دادی سے پوچھا:

''آپ سرفراز بھائی کے تعلق سے اکثر کہتی رہتی ہیں کہ گرگٹ کی طرح رنگ بدلنے میں ماہر ہے، اس کا کیا مطلب ہے۔''

''بیٹی یہ ایک مشہور محاورہ ہے جس کا مطلب ہوتا ہے اپنی بات پر قائم نہ رہنا۔ یہ محاورہ ان لوگوں کے لئے استعمال کیا جاتا ہے جو موقع اور مصلحت کے تحت اپنا رنگ بدلتے رہتے ہیں۔''

دادی کی باتیں معصوم سلمیٰ کے سر سے گزر گئیں۔ وہ کچھ دیر تک دادی کی طرف دیکھتی رہی، پھر اپنی عقل کے مطابق سوال کیا:

''دادی، گرگٹ کسے کہتے ہیں اور وہ کیسے رنگ بدلتا ہے؟''

''گرگٹ رینگنے والا ایک موذی جانور ہے۔'' ابھی دادی نے کہنا ہی شروع کیا تھا کہ بغل کے کمرے سے دادا نے سلمیٰ کو آواز دی:

''دادی کی طبیعت اچھی نہیں ہے، آؤ، اِدھر آجاؤ میں تم کو گرگٹ کے بارے میں بتاتا ہوں۔''

سلمیٰ دادا کے کمرے میں پہنچ چکی تھی اور وہ بتا رہے تھے:

''پرانی کتابوں میں بھی گرگٹ کا ذکر ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ گرگٹ کو قدرت نے کچھ ایسا بنایا ہے کہ اسی کی گردن فطری طور پر ہلتی رہتی ہے، حالات اور مصلحت کے تحت اس کا رنگ بدلتا رہتا ہے۔

گرگٹ کا Skin Transprint ہوتا ہے۔ اس کے چمڑے کے نیچے مختلف رنگوں کے دانے دار پگ منٹ ہوتے ہیں جو اس کے رنگ بدلنے میں معاون ہوتے ہیں، تیس سے چالیس سکنڈ میں رنگ بدل دیتے ہیں۔ غصہ کی وجہ سے اس کا رنگ کالا ہو جاتا ہے، جب وہ خوش ہوتا ہے تو اس کا رنگ پیلا ہو جاتا ہے، گرگٹنی کو بلانا چاہتا ہے تو اس کا رنگ گہرا سبز ہو جاتا ہے، درجہ حرارت کی وجہ سے بھی اس کا رنگ بدلتا رہتا ہے۔ اس کے رنگ بدلنے کی ایک اور وجہ یہ بھی ہے کہ گرگٹ کے جسم میں فوٹونک کرسٹل (Photonic Crystal) کی پرت ہوتی ہے جو روشنی کے انعکاس سے مختلف رنگوں میں حالات کے زیر اثر تبدیل ہوتی رہتی ہے۔

گرگٹ کا انگریزی نام Chemeleon ہے۔ یہ ایک طرح کی چھپکلیاں ہیں جن کا تعلق چامیلی رونی ڈیل نسل سے ہے۔ ان کی لگ بھگ ایک سو ساٹھ قسمیں ہیں جو افریقہ، یورپ، ایشیا اور مشرقی امریکہ میں پائی جاتی ہیں۔ گرگٹ کے پیر طوطے کے پیر جیسے ہوتے ہیں۔ ان کی آنکھیں بیک وقت دو الگ الگ سمت میں دیکھنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ اس کی زبان اور دُم دونوں لمبی بھی ہوتی ہیں۔ اگر یہ دوڑنے پر آمادہ ہو جائیں تو ایک گھنٹہ میں اکیس میل دوڑ سکتے ہیں۔ گرگٹ عام طور سے کیڑے مکوڑے، چیونٹے اور جھینگر کھاتے ہیں۔ ❀❀

عائشہ رفعت
Alamganj, Patna - 800007 (Bihar)

جب دریائی گھوڑا دھاڑا......

گرمی کی چھٹی، اُف......!

کہاں گھومنے جائیں؟ یہ سوچ کر بڑے تو بڑے ہیں، بچوں کو بھی فکر ہو جاتی ہے۔

چھوٹی خالہ کی بیٹی تحریم کے اسکول میں بھی چھٹی ہو گئی تھی اور وہ اپنی امی کو پریشان کر رہی تھی کہ منجھلی خالہ کے یہاں پٹنہ گھومنے چلیں۔ تحریم نے ماما کے بیٹے توحید بھیا اور عامر بھیا کو بھی تیار کر لیا تھا۔

ایک صبح جب وہ سبھی پٹنہ پہنچے، تو میری خوشی کی انتہا نہیں رہی، اس لئے کہ بہت دنوں بعد ان کا آنا ہوا تھا۔ میں نے تحریم سے پوچھا:

''پٹنہ میں گھومنے کی بہت ساری جگہیں ہیں، ایکو پارک، سائنس سینٹر، بہار میوزیم، چڑیا گھر، تارا منڈل۔ تمہیں کہاں گھومنے جانا ہے؟'' جواب ملا:

''چڑیا گھر...... وہاں طرح طرح کے جانور ہوتے ہیں، گھومنا پھرنا بھی ہو جاتا ہے، جانکاری بھی بڑھ جاتی ہے۔''

دوسرے دن صبح خالو کے ساتھ سبھی لوگ چڑیا گھر کے لئے نکل گئے۔ تحریم سب سے زیادہ خوش تھی، کیوں کہ وہ پہلی بار پٹنہ آئی تھی اور چڑیا گھر دیکھنے جا رہی تھی۔

چڑیا گھر پہنچ کر ہم لوگوں نے ٹکٹ لیا، اندر گئے۔ بہت سارے جانوروں کے بولنے کی آوازیں سنائی دیں تو تحریم ڈر کر اپنی ممی کے پیچھے چھپنے لگی۔ میں پٹنہ میں ہی رہتی ہوں۔ کئی بار چڑیا گھر گھوم چکی ہوں۔ ہم لوگ آگے آگے بڑھتے رہے۔ بندر، بھالو، شیر، بارہ سنگھا، زیبرا، رنگ برنگی چڑیاں، کچھوا، ہاتھی......سبھی اپنے اپنے میں مگن تھے۔ بندر کیلے کھا رہا تھا، تو بھالو مستی میں چل رہا تھا، بارہ سنگھا اپنے بچوں کے ساتھ اٹکھیلیاں کرنے میں لگا تھا۔

ہم لوگ جانوروں کو دیکھ رہے تھے اور لطف لے رہے تھے کہ اچانک بہت زور سے دہاڑنے کی آواز آئی اور سبھی لوگ اس آواز کی طرف دوڑ پڑے۔ ہم لوگ بھی گئے، مگر تحریم کا ڈر سے برا حال تھا۔ وہ ہم لوگ کے پیچھے چھپی جا رہی تھی۔ توحید آگے آگے گیا۔ ہم سب اس کے پیچھے۔ ایک بار پھر سے دہاڑنے کی آواز گونجی۔

خالہ بولیں: ''شیر ہے۔''

عامر بولا: ''ہاتھی''

میں نے کہا:

''چلو چل کر دیکھتے ہیں۔''

وہاں پر پہنچے تو دیکھا ایک بہت بڑا سا جانور جس کا سر گھوڑے کے جیسا اور بدن ہاتھی کے جیسا تھا، پانی سے باہر نکلا ہوا ہے اور دہاڑ رہا ہے۔ ہم لوگوں نے اسے پہلی بار دیکھا تھا۔ توحید، عامر نے کہا:

''میں نے اسے تصویر میں دیکھا ہے یہ دریائی گھوڑا ہے۔''

''تم نے ٹھیک پہچانا'' خالو جو ذرا پیچھے رہ گئے تھے، قریب آتے ہوئے بولے:

''......گھوڑا، دریائی...... یہ کیسے خالو جان......''

تحریم نے پوچھا:

''ہاں! دریائی گھوڑا بھی ہوتا ہے۔ اس کے بارے میں گھر چل کر بتائیں گے۔''

پھر ہم لوگ دوسرے جانور کی طرف بڑھ گئے۔ گھومتے گھومتے شام ہو گئی۔ سبھی لوگ چڑیا گھر سے باہر نکلے۔ خالہ نے ہم لوگوں کو آئس کریم کھلایا اور پھر ہم سب گھر آ گئے۔

گھر پہنچ کر بھی تحریم کو سکون نہیں تھا۔ اس کو دریائی گھوڑے کے بارے میں جاننا تھا۔ وہ خالو کے آگے پیچھے کر رہی تھی۔ خالو نے کھانا کھانے کے بعد سبھی بچوں کو بیٹھایا اور بتانا شروع کیا:

''دنیا میں قوی اور وزنی جانور کے فہرست میں ہاتھی اور سفید گینڈا کے بعد دریائی گھوڑے کا نمبر آتا ہے۔اس کی اونچائی ۵ فٹ اور لمبائی ۱۰ سے چودہ فٹ تک ہوتی ہے۔اس کا وزن ۴ٹن ہوتا ہے۔''

''مگر اس کو دریائی گھوڑا کیوں کہتے ہیں خالو جان؟''

تحریم کو اب بھی حیرت تھی۔

''چونکہ اس کا سر دور سے گھوڑے کی طرح دکھائی دیتا ہے اور وہ پانی میں رہنا پسند کرتا ہے اس لئے اس کو دریائی گھوڑا کہتے ہیں ......کیا تم لوگ جانتے ہو، اگر دریائی گھوڑا پانی میں نہیں رہے تو کیا ہوگا؟ اس کی کھال کے مساموں سے ایک سرخ چپچپا مادہ نکلتا ہے جو اس کی کھال کو خشک ہونے نہیں دیتا۔ اگر یہ مادہ دھوپ میں خشک ہو جائے تو اس کی کھال سوکھ کر پھٹ جائے گی جس سے اس کی موت بھی ہو سکتی ہے۔اس مادہ کو خشک ہونے سے بچانے کے لئے دریائی گھوڑا پانی اور کیچڑ میں رہتا ہے۔''

''مگر خالو......وہ اتنا موٹا اور وزنی کیسے تھا؟''

''دریائی گھوڑے کے جسم پر ۲۰۰ پونڈ چربی ہوتی ہے اور اس چربی کا وزن پورے جسم کے وزن کا ۱۶ فیصد ہوتا ہے، اس لئے وہ موٹا اور وزنی دیکھتا ہے۔''

''خالو جان...... میں جب بھی چڑیا گھر گئی، میں نے اسے ہمیشہ پانی کے اندر ہی پایا، یہ کبھی باہر نہیں رہتا تھا چونکہ آج وہ خشکی پر تھا اس وجہ سے آج میں نے بھی دریائی گھوڑے کو پہلی دفعہ دیکھا۔''

میں نے گویا خالو کو معلومات بڑھائی۔

''ہاں! ٹھیک کہتی ہو......دریائی گھوڑہ زیادہ تر پانی میں رہتا ہے اسے سست رفتار ندی میں پڑے رہنے میں بہت زیادہ سکون ملتا ہے۔ دن کے وقت جب سورج پوری طرح گرم ہو جاتا ہے تو وہ کیچڑ میں پڑے رہنے کو ترجیح دیتا ہے۔

اس کی آنکھ، کان، نتھنے سر کے اوپری حصے میں ہوتے ہیں جسے وہ تیرتے وقت پانی کے اوپر رکھتا ہے۔خطرہ ہونے پر پانی کے اندر چلا جاتا ہے۔ وہ پانی کے اندر ۱۰ سے ۱۵ منٹ تک رہ سکتا ہے۔اس کے پیر بہت چھوٹے چھوٹے ہوتے ہیں جو اسے پانی میں تیرنے میں مدد کرتے ہیں، لیکن تمہیں یہ جان کر حیرانی ہوگی کہ پانی میں رہنے والا یہ جانور دوڑ بھی سکتا ہے۔اس کے دوڑنے کی رفتار ۲۰ میل فی گھنٹہ ہوتی ہے۔اس کی دم چھوٹی ہوتی ہے اور کان بھی چھوٹا ہوتا ہے، لیکن سماعت بہت تیز ہوتی ہے۔دشمنوں کی آہٹ پا کر فوراً پانی کے اندر چلا جاتا ہے۔ اس کے دانت اور جبڑے بہت مضبوط ہوتے ہیں۔''

عامر جلدی سے بولا:'' جب وہ دھاڑ رہا تھا اس وقت میں نے اس کا منہ دیکھا تھا، مانو کوئی غار ہو۔''

''ہاں! اس کا منہ اور دانت بہت خوفناک ہوتے ہیں۔وہ اپنے بڑے بڑے سفید خونخوار دانتوں سے مگر مچھ کی کھال کو گنے کے چھلکے کی طرح چھیل دیتا ہے۔ یہ سبزی خور جانور ہے۔جنگلی گھاس، دریائی پودے، جھاڑیاں، ٹہنیاں، پتے اس کی پسندیدہ غذا ہیں۔ اس کی خوراک ۴۰۰ پونڈ ہے۔''

دریائی گھوڑے کی دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ رات بھر کھانا تلاش کرتا ہے اور خوب کھاتا ہے اور سورج طلوع ہوتے ہی جھیل، دریا میں چلا جاتا ہے۔اس کی عمر ۴۰ سال سے ۵۰ سال تک ہوتی ہے اور سنو......دنیا میں اس کی دو قسمیں پائی جاتی ہیں:

(۱) بڑا دریائی گھوڑا (۲) بونا دریائی گھوڑا

تنزانیہ، کانگو، یوگانڈہ، کینیا کے شمالی حصہ کی ندیوں اور جھیلوں میں اس کی تعداد زیادہ دیکھی جاتی ہے۔

چلو بچو! رات ہوگئی، اب سونے کے لئے سبھی اپنے اپنے کمرے میں جاؤ۔ دیکھو تحریم! تم کو جماہی بھی آرہی ہے، تم سب تھک بھی گئے ہو۔خالو نے یہ کہہ کر بات مکمل کی اور اپنی دوا کا پیکٹ ڈھونڈنے لگے۔ ❁❁

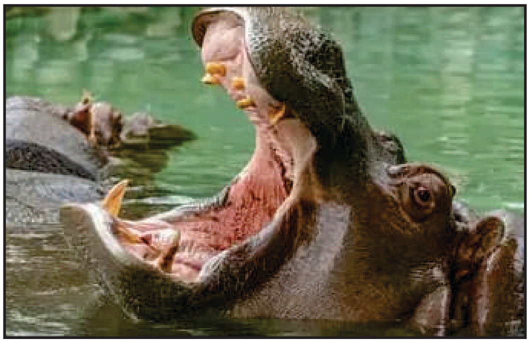

رضوان احمد
Data Market, Peerbahore, Patna - 800006

خیرات اور دان

پیارے بچو! خیرات اور دان عام بول چال میں رہنے والے مشہور الفاظ ہیں۔ خیرات، خیر کی جمع ہے، یہ لفظ عربی سے آیا ہے اور اس کے معنی ہیں بھلائیاں، نیکیاں، صدقہ۔ ''خیرات دینا'' ایک محاورہ ہے جس کا مطلب ہے، اللہ کے لئے دینا، اللہ کی راہ پر دینا —— اس طرح یہ بات خود بخود سمجھ میں آجاتی ہے کہ خیرات کے عمل کا رشتہ اللہ کی خوشنودی سے جڑا ہوا ہے۔

کتابوں میں لکھا ہے کہ صدقہ وخیرات سے اللہ خوش ہوتا ہے اور بلائیں ٹل جاتی ہیں۔ نیکی وخیرات کا جذبہ رکھنے والوں اور اسے اپنی عادت بنا لینے والوں کو ''مخیرّ'' کہا جاتا ہے اور ایسے لوگ سماج میں خاص طور سے بڑی عزت پاتے ہیں، مگر یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ دلوں کا حال اللہ ہی جانتا ہے اور وہ ہماری نیتوں سے واقف ہے، اس لئے صدقہ وخیرات کے ایسے کسی عمل کا کوئی مول نہیں، جس میں نام ونمود، شہرت یا اپنی کسی طرح کی کوئی غرض چھپی ہوئی ہو۔

خیرات کی یوں تو بیشمار شکلیں ہوتی ہیں، مگر سماج میں عام طور سے، مال ودولت خرچ کر کے کسی کی مدد کرنا ہی خیرات وصدقہ سمجھا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ اوپر والا ہاتھ یعنی دینے والا ہاتھ، نیچے والے ہاتھ یعنی لینے والے ہاتھ سے بہتر ہے۔ کسی بھوکے کو کھلانا، کسی ننگے کو پہنانا، کسی محتاج کی ضرورت پوری کر دینا، کسی پریشان حال آدمی کی پریشانی دور کر دینا صدقہ ہے، یہاں تک کہ اپنی باتوں سے کسی کا دل خوش کر دینا، اس کے چہرے پر مسکان لا دینا بھی صدقہ ہے۔

صدقہ وخیرات ایک ایسا عمل ہے، جسے سبھی مذاہب میں اہمیت دی گئی ہے۔ ہندی کے لفظ ''دان'' کا مفہوم بھی لگ بھگ وہی ہے، جو صدقہ، بخشش کا مفہوم ہے۔ ''دان پن''، یعنی خیر خیرات، یہاں بھی غور کرنے کی بات یہ ہے کہ دان کا رشتہ ''پن''، یعنی ثواب سے جڑا ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صوفی بزرگوں کی خانقاہوں میں لنگر کا اہتمام رہتا ہے۔ سکھوں کے گردوارے اور دوسرے مذاہب کی عبادت گاہوں میں بھی لنگر بٹتے ہیں اور ایسا کیوں نہ ہو کہ خیرات اور دان کا مقصد ہی ہے، کمزور طبقے کی مدد اور خلق خدا کی دستگیری۔ خیرات ہمدردی کے جذبے کو عملی شکل دینا ہے، ورنہ مقصد اور فائدے کی بات چھوڑ دی جائے تو ہر آدمی سمجھ سکتا ہے کہ سونا جمع کرنا یا کنکر جمع کرنا دونوں برابر ہے۔

خیرات اور دان سے سماج کے اقتصادی نظام میں ہزار ناانصافی کے باوجود تھوڑا سا توازن یقیناً بنتا رہتا ہے۔ بہت سارے لوگ صلاحیت رکھتے ہوئے خیر خیرات، دان پن سے بھاگتے ہیں اور یہ نہیں سوچتے کہ اگر آج وہ اپنے ہاتھ سے اور اپنی خوشی سے خرچ نہیں کریں گے تو کل دوسروں کے ہاتھ سے اور ان کی ناخوشی سے وہ دولت خرچ ہوگی، اس لئے کہ فطرت کا اصول یہی ہے۔

خیرات یا دان میں بھید بھاؤ کے لئے کوئی جگہ نہیں ہوتی، یہاں صرف انسانیت دیکھی جاتی ہے۔ یہ مخلوق خدا کی خدمت ہے اور انسان کیا، چرند وپرند کو دانے ڈالنا بھی خیرات یعنی نیکیاں ہیں۔

مخیرّ آدمی کی ہر دور میں قدر ہوئی ہے، تاریخ میں لکھا ہے کہ شیخ علی چشتی نامی ایک صوفی بزرگ جب چنگیز خاں کی قید میں آگئے تھے تو اُن کی اور ان کے والد کی سخاوت وفیاضی کا حال سن کر چنگیز خاں نے انہیں نہ صرف رہا کر دیا تھا بلکہ بہت عزت بھی دی تھی۔

خیرات اور دان کی باتیں ہو رہی ہیں تو یہ دلچسپ بات بھی جاننی چاہئے کہ ہمارا ملک اُتر اور دکھن کے دو حصوں میں بٹا ہوا ہے تو اس کا رشتہ بھی خیرات اور دان دکشنا ہی سے ہے، دکن یا دکھن کا لفظ یوں آیا کہ جب آریا لوگ بھارت میں آئے تو سفر کے دوران اُن کے دائیں ہاتھ یعنی دان دکشنا دینے والے ہاتھ کی طرف جو علاقہ پڑا، اس کی پہچان انہوں نے اسی حوالے سے کی تھی۔ اس تاریخی بات سے یہ بھی معلوم ہوا کہ خیرات دینے کی ایک اپنی تہذیب ہے اور یہی تہذیب آج بھی ہر جگہ باقی ہے کہ ہم جب کسی کو کچھ دیتے ہیں تو سیدھے یعنی داہنے ہاتھ سے دیا کرتے ہیں۔

❋❋❋

آچاریہ شوکت خلیل

......اگر تم لوٹ آتے

''بہر حال میں تو صرف تمہارے لئے دعا ہی کر سکتا ہوں......اللہ پاک تمہیں حوصلہ عطا کرے......ویسے اگر مجھ سے تم پوچھتے ہو کہ کیا کروں تو میں یہی کہوں گا کہ اچھا ہوتا اگر تم لوٹ آتے......کیوں کہ اپنے وطن کی بہت بری موت بھی ہمیشہ بہت اچھی ہوا کرتی ہے، اس لئے کہ کبھی کبھی وہ اُن دشمنوں کے ہاتھ سے بھی ملتی ہے جو کبھی دکھ اور سکھ کے ساتھی اور بہت اپنے ہوا کرتے تھے۔'' (اگر تم لوٹ آتے ص ۲۴۷ سے ماخوذ آصف علی خاں کی اپنے بیٹے عرفات سے فون پر گفتگو کا ایک حصہ جو گمبھیر مکالمہ بھی ہے اور ناول کا پیغام بھی)

جلتا ہوا سا سوال

''یوسف نے اپنا تانگہ اور گھوڑا نیلام کر کے کل روپے ملک کے وفاعی فنڈ میں دے دیئے اور خود وہ فوج میں داخل ہو کر وطن کی سرزمین سے چینیوں کو کھدیڑنے کے لئے چلا گیا جس پرمٹ کی انتظاری میں وہ تھا، وہ پرمٹ اُسے مل گیا تھا۔ یہاں جب میں نے لوگوں سے یہ سنا تو جانے کیوں میری گردن جھک گئی......ایک جلتا ہوا سا سوال اُبھر کر میرے سامنے ناچ اٹھا۔ یوسف کردار کا غازی نکلا، مگر تم......تم ادیب، تم شاعر، تم ڈاکٹر، تم......تم خود بتاؤ، کیا یہ جنگ صرف تحریروں کے ذریعہ جیتی جا سکتی ہے؟ اور مجھے محسوس ہوا، میں جو کہانی لکھ کر لایا ہوں اس میں کوئی جان نہیں ہے، کوئی حرارت نہیں ہے......اس میں الفاظ کے توپ ہیں اور الفاظ ہی کے گن اور کارتوس ہیں، جنہیں الفاظ کے سپاہیوں نے اپنے اپنے خیال کے کاندھوں پر اُٹھا رکھا ہے......آج اپنے ساتھیوں کے لئے مجھے ایک نئی تجویز رکھنی چاہئے۔'' (افسانہ ''تجویز'' ماہنامہ ''راوی'' مئی ۱۹۶۳ء ص ۵۶)

آچاریہ شوکت خلیل ابن خلیل احمد جگر ناصری کی تاریخ ولادت ۴ جون ۱۹۴۰ء اور جائے ولادت محلّہ شاہ گنج دربھنگہ ہے۔ اپنے وطن میں ابتدائی تعلیم پانے کے بعد اور اپنے وطن ہی کے قاضی بہیڑہ نامی محلّہ میں شادی کے بعد انہوں نے کلکتہ کا رُخ کیا اور وہاں ''آزاد ہند'' وغیرہ جیسے روزناموں میں لکھتے رہے اور صحافتی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ ''آچاریہ'' کا خطاب بھی لیا، پھر اپنے وطن آکر ایک طرف لہریا سرائے میں ''من سکھ بیکری'' قائم کیا تو دوسری طرف ۱۹۸۴ء کے آس پاس اردو ہندی میں پندرہ روزہ ''آگ کا دریا'' بھی نکالا۔ اس سے قبل ۱۹۷۴ء میں انہوں نے ''ہم اور آپ'' نامی پندرہ روزہ بھی نکالا تھا۔ آچاریہ شوکت خلیل ''ٹائمز آف انڈیا'' اور دیگر روزناموں سے بحیثیت نامہ نگار اور روزنامہ ''قومی تنظیم'' پٹنہ سے بحیثیت کالم نگار مدتوں وابستہ رہے اور میتھلی میں بھی انہوں نے بڑی بیباکی سے لکھا۔ آچاریہ شوکت خلیل فکشن نگاری میں بھی مہارت رکھتے تھے۔ اُن کے افسانے متعدد مستند ادبی رسالوں میں اشاعت یافتہ ہیں مثلاً ''ماہنامہ'' راوی'' پٹنہ، مئی ۱۹۶۳ء کے شمارے میں ان کی کہانی ''تجویز'' دیکھی جا سکتی ہے، لیکن آچاریہ شوکت خلیل کی اصل ادبی شہرت و شناخت ان کے ناول ''اگر تم لوٹ آتے'' سے ہے جو ۲۰۰۳ء میں چھپا تھا۔ اس ناول کا پیش لفظ ''حرف چند'' کے عنوان سے ڈاکٹر قمر رئیس نے لکھا ہے۔ ''آچاریہ شوکت خلیل بحیثیت فکشن نگار'' کے موضوع پر ۲۰۱۷ء میں دربھنگہ یونیورسیٹی سے پی ایچ ڈی بھی ہو چکی ہے اور ''مائناریٹی ڈینٹل کالج'' دربھنگہ کے موسس آچاریہ شوکت خلیل کے خاندانی احوال کا تذکرہ ڈاکٹر امام اعظم کی کتاب ''انساب و امصار'' مطبوعہ ۲۰۲۰ء میں بھی ملتا ہے۔ تقریباً ۸۳ سال کی عمر پا کر ۱۱ر نومبر ۲۰۲۳ء کو آچاریہ شوکت خلیل کی وفات ہوئی۔ (تعزیتی شذرہ مشمولہ سہ ماہی اُردو بک ریویو نئی دہلی، اکتوبر، نومبر، دسمبر ۲۰۲۳ء ص ۸۰ و ص ۸۱ سے استفادہ کے ساتھ)

ZABAN-O-ADAB

Monthly Journal of Bihar Urdu Academy

(Under The Department of Minority Welfare, Govt. Of Bihar)

Registered with Registrar, News Paper of India R.N.No.- 26469/75

SSPOST Regd. No.- PT- 58 upto- 31-12-2026

Bihar Urdu Academy, Urdu Bhawan, Ashok Rajpath, Patna - 800004

Volume : 46 **June 2025** **No. 06**

مولوی محمد عزیز مرزا دہلوی

پیدائش ۱۸۶۵ء— وفات ۱۹۱۲ء

ایڈیٹر، پبلشر ابرار احمد خان، سکریٹری بہار اردو اکادمی نے پاکیزہ آفسیٹ پریس، شاہ گنج، درگاہ روڈ، پٹنہ۶ ۸۰۰۰۰ میں
طبع کرا کے دفتر بہار اردو اکادمی، اردو بھون، اشوک راج پتھ، پٹنہ۴ ۸۰۰۰۰ سے شائع کیا

Printed and published by *Ibrar Ahmad Khan* Editor & Secretary Bihar Urdu Academy,
on behalf of Bihar Urdu Academy, Urdu Bhawan, Patna-4 through Pakiza Offset Press
Shahganj, Dargah Road, Patna - 800006

₹ 15/-